قیمت ۸ روپے

انٹرنیشنل
ملی ٹائمز
نئی دہلی



پردہ ...

مگر کس حد تک؟؟

اسلام اور روایت پرستی کے مابین گرماگرم بحث پر ایک معتدل رائے



AUSTRALIA	A$ 4.50	DENMARK	D.KR. 1700	ITALY	LIT. 4000	NEW ZEALAND	NZ$ 5.00	SRILANKA	Rs. 50
BANGLADESH	Taka 25	FRANCE	Fr 13	JAPAN		NORWAY	N.Kr 15.00	SWEDEN	Kr 20
BELGIUM	Fr 90	FINLAND	F.MK 13.00	KOREA	W 2.200	PAKISTAN	Rs. 20	SWITZERLAND	Fr 4
BRUNEI	B$ 5.50	GERMANY	DM 4.50	MALAYSIA	RM 4.00	PHILIPPINES	P 30	THAILAND	B 50
CANADA	C$ 4.50	HONG KONG	HK$ 19.00	MALDIVES	Rf 15.00	SAUDI ARABIA	SR 4	U.K.	£ 2.00
CHINA	RMB 16.00	INDONESIA	RP 4,500 (INC PNN)	NETHERLANDS	G 4.30	SINGAPORE	S$ 3.50	U.S.A.	US $ 3.50

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور کفر کے درمیان خون آشام معرکہ آرائی کا وقت اب قریب آتا جارہا ہے۔ مغرب کے مختلف شہروں میں اب تک جو لوگ پرسکون انداز سے اسلام کی خدمت کا خواب بنا کرتے تھے انھیں بھی اندازہ ہو چلا ہے کہ اب ٹھنڈے ٹھنڈے اسلام کی خدمت کئے جانے کا زمانہ ہوا ہو گیا۔ گذشتہ دنوں برطانوی پارلیامنٹ نے دہشت پسندی سے متعلق جو نیا قانون پاس کیا ہے اس نے یورپ میں موجود مسلمانوں کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ یہ قانون اتنا مبہم اور غیر واضح ہے کہ اس کا سہارا لے کر اب حکومت بآسانی کسی بھی مسلم گروہ پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ آپ فنڈامنٹلسٹ مسلمان ہوں، خلافت اسلامی کا خواب اپنے دلوں میں سجائے بیٹھے ہوں یا آپ صرف نماز روزہ کی حد تک مسلمان رہنا چاہتے ہوں، نئی بدلتی صورت حال میں آپ کے لئے سکون کا کوئی لمحہ نہیں۔

جنگ کی لپٹیں بلقان کے قریبی علاقوں میں پھیلتی جارہی ہیں، کوسووو میں بے شعور مسلمانوں کی سیکولر قیادت کو ہر لمحہ پسپائی کا سامنا ہے۔ شہر ویران ہو چکے اور بیاباں پناہ گزینوں کے خیموں سے آباد، البانیہ اور مقدونیہ کے مسلمانوں میں غم و غصہ تو ہے لیکن ذلت کی زندگی سے نجات کے لئے اضطراب کی کیفیت مفقود ہے۔ ہر شخص اپنی ناک تک دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ چاہتا ہے اس کی زندگی کے سکون میں خلل واقع نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ کسی جزیرے میں جہاں کسی دیو استبداد کی حکومت تھی، مسافروں کا ایک بحری قافلہ جا پہنچا۔ اس چھوٹی سی ریاست میں ایک جہنم ارضی آباد تھی۔ حکمرانوں نے اذیت کی مختلف قسمیں ایجاد کر رکھی تھیں، نت نئے نفسیاتی حربے اور اعصاب کو مستقل خوف میں مبتلا رکھنے والے نئے نئے طریقے استعمال کئے جاتے تھے، مسافروں پر اس جزیرے میں ایک ایک لمحہ زندہ رہنا گویا کئی کئی جہنم کا بیک وقت عذاب سہنا تھا۔ یوں جانیے وہ جہنم جیتے اور جہنم مرتے تھے لیکن موت ان کی دسترس سے دور تھی۔ مسافروں میں اس عقوبت گاہ سے نکل بھاگنے کی طلب بھی پائی جاتی تھی۔ وہ ہر روز فرار کے لئے پروگرام بھی ترتیب دیتے تھے۔ ہر شام متفقہ طور پر یہ طے پاتا کہ اگلی صبح اگر کوئی جہاز اس جزیرے کے قریب سے گزرا تو وہ اسے اپنی طرف ضرور متوجہ کریں گے لیکن دوسری صبح عین اس لمحے ساحل سے قریب جب کوئی جہاز دکھائی دے جاتا تو وہ یہ سوچ کر خاموش رہ جاتے کہ اس جزیرے میں جیسی بھی بھلی بری زندگی گزر رہی ہے کم از کم جسم کا جان سے رشتہ تو قائم ہے۔ رزق کی بندھی ٹکی مقدار تو صبح شام مہیا ہو جاتی ہے۔ کیا پتہ آنے والی نئی صبح رزق کا یہ نوالہ بھی ہمارے حلق سے کھینچ لے اور ہم نئی صبح اور باعزت زندگی کی تلاش میں اس بے جان زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔

ملی ٹائمز کی دعوت پر اگر اب بھی قبول عام کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے اور اگر اب بھی اذیت ناک زندگی سے نجات کی طلب عام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ خوف کی زندگی کے اس قدر خوگر ہو چکے ہیں کہ ہمیں ایک باوقار زندگی کے خیال سے خوف آتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اپنی ہارتی ہوئی جنگ کے ہر مرحلے میں اگر موجودہ سیکولر نظام کے استحکام کی خواہش کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ اگر یہ نظام جبر رخصت ہو گیا تو ایک باوقار زندگی کا بوجھ یہ کس طرح اپنی گردنوں پر اٹھائیں گے۔ یہ وہی صورت حال ہے کہ جب کسی اساطیری قصے میں جزیرۂ خوف کے باسیوں میں اپنے آپ کو تنہا پا کر کوئی شخص صرف خیال سے خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ آخر وہ عام لوگوں کی طرح خوفزدہ کیوں نہیں ہے؟

(ادارہ)

ملی ٹائمز

انٹرنیشنل — نئی دہلی

نومبر ۱۹۹۸ء

قیمت: آٹھ روپے

سالانہ زر تعاون: ۱۰۰ روپے

بیرون ممالک سے: ۲۵ امریکی ڈالر

سالانہ زر تعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ ارسال کریں

ڈرافٹ پر صرف اتنا لکھیں

Milli Times International New Delhi

اس شمارے میں

پردہ ۔۔۔ مگر کس حد تک؟
حجاب اور تعلیم میں فوقیت کس کو؟
کیا عورتیں منصب قضا کی اہل نہیں؟
دینی مدارس پر آئی ایس آئی کا سایہ
پاکستان میں نفاذ شریعت کا ڈرامہ
کیا تعلیم سارے مسائل کا حل ہے؟
ایران میں الٹی دوڑ کا آغاز
ملیشیا میں لبرل اسلام کا زوال
سیکولرازم ایک لغو اور غیر اسلامی نظریہ
اس کے علاوہ دیگر اہم موضوعات اور مستقل کالم

یکے از مطبوعات مسلم میڈیا ٹرسٹ

ایڈیٹر: محمد احمد سعید

ملی ٹائمز انٹرنیشنل

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

فون: ۶۸۲۷۰۱۸، ۶۹۲۶۲۳۶

فاکس: ۶۹۴۶۶۸۶ (۱۱۰)

E-mail: militime@del3.vsnl.net.in

ایک انقلابی تحریک

مکرمی۔ آپ نے جس انقلابی تحریک کا آغاز کیا ہے، اللہ اسے کامیابی سے ہمکنار کرے، مگر دو باتوں کا خاص خیال رکھا جائے کہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محور بنایا جائے اور ہو بے لوث قیادت۔

مسلم امت اس وقت جس بحرانی اور اضطرابی کیفیت سے گذر رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بوسنیا، فلسطین، کشمیر میں جو قتل عام کیا گیا اس سے چنگیزیت بھی شرما رہی ہے۔ سو، ان حالات میں آپ کا اقدام قابل تحسین تو ہے مگر ایک بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ یہ اسٹیج ٹوٹنے نہ پائے اور کوئی مثبت کام ہو۔

آپ نے اپنے جرنل میں ہر پہلو سمونے کی کوشش کی ہے، چاہے وہ توحید ہو، عشق مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہو، فقہی مسائل ہوں، روزمرہ پیش آنے والے معاملات ہوں یا تربیتی مراحل۔ سیاسی، تبلیغی اور انقلابی جدوجہد کا غماز جریدہ۔ مگر میری رائے ہے کہ اس میں تلاش رشتہ کے لئے ایک صفحہ نامزد کر کے سماجی اور فلاحی کام بھی ہاتھ میں لیا جائے تاکہ ملی ٹائمز کے تحت جو دینی اور اصلاحی تربیت کی جا رہی ہے وہ پروان چڑھے اور مسلم معاشرہ کا قیام عمل میں آئے۔ دراصل یزیدیت اور نمرودیت کو ختم کرنے کے لئے مسلم معاشرہ کو فاطمہ جیسی ماں کی اشد ضرورت ہے تاکہ حسین پیدا ہو جو انقلابی اور اصلاحی خطوط پر مسلم معاشرہ کی قیادت کر کے وہ نظام لا سکے جس کا قرآن تقاضائی ہے۔

امید کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو اس منزل سے ہمکنار کرے جس کے حصول کے لئے آپ نے اپنے قائد کے پرچم تلے اس پر خطر سفر کا آغاز کیا ہے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

سید محمد اعجاز، کشمیر

آسان زبان کا استعمال کریں

میں آپ سے مؤدبانہ ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ملی ٹائمز عالموں کے لئے نکلتا ہے یا عام لوگوں کے لئے؟ اگر عالموں کے لئے نکلتا ہے تو عالموں کا حلقہ علاوہ معدودے چند کے غلبہ اسلام کی بات کو سوچتا بھی نہیں، کرنے کی بات تو بہت دور ہے۔ اور اگر عام لوگوں کے لئے نکلتا ہے تو عام لوگ اتنی سخت اردو سے واقف نہیں ہیں اور خاص طور سے نوجوانوں کا حلقہ تو اردو سے کوسوں دور ہے۔

لہذا آپ سے گزارش عرض یہ ہے کہ ملی ٹائمز کے ذریعہ سے غلبہ اسلام کی تحریک کو عام لوگوں تک پہنچائیں، اس کے ذریعہ سے اردو ثقافت کو فروغ نہ دیں۔ اگر ملی ٹائمز کو عام فہم اور زیادہ سے زیادہ سہل زبان میں نہیں بدلا گیا تو جماعت اسلامی کی طرح یہ تحریک بھی چند مخصوص لوگوں کی تحریک بن کر رہ جائے گی اور عام لوگوں کو یہ معلوم بھی نہیں ہوگا کہ اس ہندوستان میں غلبہ اسلام کی کوئی تحریک چل رہی ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ عام مسلمان اردو سے کتنے دور ہیں اور کہاں اتنی مشکل زبان! لہذا آپ کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ملی ٹائمز کو زیادہ سے زیادہ آسان زبان میں شائع کریں۔

رحمت اللہ، گورکھپور

مسلم سیاسی پارٹی

محترمی۔ آپ جو مسلم سیاسی پارٹی تشکیل دینے جا رہے ہیں وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔ بہت دنوں سے اس کی سخت ضرورت بھی محسوس کی جا رہی تھی کیونکہ آج قوم کی کشتی ایک ایسے بھنور میں پھنس چکی ہے جہاں سے اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے، تاہم اسے ایسے ہی لوگوں کی تلاش ہے جو اسکی کشتی کو بلاخوف و خطر ساحل تک لگا دے اور وہ کشتی بلاشبہ تعلیم کی ہی ہو سکتی ہے۔ آج جسطرح سیاسی صف بندی کی ضرورت ہے اسی طرح تعلیم کی بھی، تاکہ یہ بات کسی بھی پہلو کو اپنے نظریے سے دیکھ سمجھ اور پرکھ سکیں۔

آج ہم ہندوستان کی دوسری سب سے بڑی اکثریت ہونے کے باوجود سب سے زیادہ پس ماندہ فرقہ ہیں لیکن افسوس یہ نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ انہیں نہ تو اس بات کا علم ہے اور نہ احساس۔ اس لئے اگر اس قوم کو ترقی کے منازل طے کرنا ہے تو سب سے پہلے تعلیم کو عام کرنا ہوگا۔ اسی کی بدولت انہیں سیاسی، معاشی اور اقتصادی ضرورتوں اور بدلاؤ کی سمجھ آئے گی اور اپنے وجود کا احساس ہوگا۔ اس پیغام کو عام کرنے کی آج سب سے پہلی اور سخت ضرورت ہے۔

سیدہ نصرت پروین۔ مونگیر۔ بہار

ملت کے قائدین سے ۔ ۔ ۔

مکرمی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ جیسا دانشور مفکر سرزمین ہند پر ملت اسلامیہ میں موجود ہے جو اپنے مضبوط کندھوں پر ملت کے زوال کا بوجھ اٹھائے ہوئے ملت کی بے جان جسم میں اسلامی روح پھونک رہا ہے۔ میں بارگاہ الہی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت آپ کی تمام جدوجہد کو قبول عطا فرمائے اور راہ حق میں اٹھائے ہوئے آپ کے ہر قدم پر کامیابی اور کامرانی عطا فرمائے۔ آمین

آگے کچھ لکھنے سے پہلے اس بات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کیا حیثیت حاصل ہے اور ملت اپنے تمام قائدین، سربراہوں کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟ اگر گذشتہ پچاس سالوں کا جائزہ لیا جائے تو ملت کی حیثیت کی ایک خوفناک تصویر ابھرتی ہے جو دلوں کو بے چین کرتی ہے۔ ابھرتی ہوئی تصویر کا خاکہ میرے خیال سے کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ آزاد ہندوستان کی تمام حکومتوں نے اس امت مسلمہ پر قہر برپا کیا جس نے ہندوستان کی غیرت اور وقار کی حفاظت کیلئے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اپنا بے شمار خون پانی کی طرح بہا کر ہندوستانی تاریخ میں ایک مثال قایم کر دی۔ جس امت نے اپنا سب کچھ جنگ آزادی میں قربان کر دیا آج اسی امت مسلمہ سے وفاداری کا ثبوت مانگا جا رہا ہے۔

۲۔ آزادی کے بعد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ پاکستان ایک نئے ملک کی شکل میں پیش ہوا۔ ملت کا ایک ذہین طبقہ ایک بڑی تعداد میں پاکستان چلا گیا جو ذہین طبقہ یہاں رہ گیا اس کے ہاتھ سے سارے اختیار چھین لئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملت نے جنگ آزادی میں جو جو قربانیاں پیش کی تھیں ان کو ہندی تاریخ سے مٹا دیا گیا اور آج کی نسل کو معلوم ہی نہیں کہ ان کے بزرگوں نے سرزمین ہند کی غیرت اور وقار کی حفاظت کے لئے کیا کیا

قربانیاں پیش کی ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آج کی نسل اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کی بھی قوت کھو چکی ہے۔

۳۔ ہندوستان کی تمام حکومتیں امت مسلمہ کے غیرت اور وقار پر لگاتار ضرب لگاتی رہی۔ مسلمانوں کو کمزور کرنے اور ہر طرح کے نقصان پہنچانے کے لئے مغربی تنظیموں سے مل کر آج پچاس سالوں سے کئی بڑی تحریکیں کام کر رہی ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت مسلمہ آج ہر جگہ پر پچھڑ گئی۔ آج ہندوستان کی تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں مسلم ووٹروں کے ذریعے اپنی اپنی حکومتیں قایم کرتی رہی ہیں۔

۴۔ ۱۹۷۰ تک ملت کے افراد پر شاسنک سیوا میں 33% تھے، آج ۱۹۹۸ تک گھٹتے گھٹتے ایک فیصدی تک پہنچ گئے۔ مسلم نوجوانوں کو نوکری کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی۔ ہریجن طبقہ کو ہر جگہ محفوظ کر دیا گیا۔ سورن طبقہ تو پہلے سے ہی ہر جگہ موجو ہے۔ ریزرویشن کے بعد بچے ہوئے جگہ پر انہی کا قبضہ ہونے کے لئے وصیت کر دی گئی۔ اب بچے غلام جو پچاس سالوں سے انہی کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور یہ مسلمانوں کی بے غیرتی کی وجہ سے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۵۔ علم کے میدان میں مسلمانوں کے کارناموں کو دیکھ کر اہل باطل کا کلیجہ خوشی سے پھٹا جا رہا ہے۔ افسوس صد افسوس! سو بچوں میں ایک بھی مسلم بچہ فٹ نہیں بیٹھتا۔ ملت کو علم کے میدان میں مائنس سکیل میں پہنچا دیا گیا اور سربراہ ملت چند دار العلوموں کو دیکھ کر سیکولر نظام کا مالا جپ رہے ہیں۔

۶۔ سیاست کے میدان میں ملت اسلامیہ کو ایک دم سے ناکارہ کر دیا گیا۔ جب سے خلافت عثمانیہ پارہ پارہ ہوئی ایک زبردست سازش کے تحت مسلمانوں کی اجتماعیت کو توڑ کر کے انفرادیت میں تبدیل کر دیا۔ ہندوستان کے تمام سیاسی پارٹیوں اور لیڈر برہمن ازم کے سازش کے تحت مسلمانوں کو انفرادی حیثیت سے تقسیم کرنے کو تیار ہے لیکن مسلمانوں کو اجتماعی حیثیت سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اسی سازش کے تحت تمام پارٹیاں مسلم معاشرے میں شبخون مارتی رہتی ہیں اور انفرادی حیثیت سے مسلمانوں کو اپنے میں جذب کر رہی ہے، اس کے نتیجے میں اس پچاس سالہ دور آزادی نے مسلم معاشرے کو غلامی کی زندگی گزارنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔

۷۔ معاش کے میدان میں مسلمانوں کی کمر توڑنے کے لئیل جو بزنس مسلمانوں کے مالکانہ اختیار میں تھے حکومت کی بھید بھاؤ پالیسی کی وجہ سے ایک سازش کے تحت بند کرا دیا گیا یا دوسری مخالف قوموں کے ہاتھ میں پہنچا دیا گیا۔ حکومت کی انہی سازشوں کے تحت مسلم صنعتی میدان کو فساد کرا کے تباہ اور برباد کر دیا گیا۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ فساد صرف مسلم علاقوں میں ہوتا ہے، سرکاری اعداد و شمار کے حساب سے ۱۲۰۰۰ فساد ہوئے اور غیر سرکاری اعداد و شمار یعنی اسلامی تنظیموں کے حساب سے ۲۲۰۰۰ فساد ہوئے۔ اگر سرکاری اعداد کو مانا جائے تو ۵۰ سال میں ۱۸۲۵۰ دن ہوتے ہیں اور اتنے دنوں میں ۱۲۰۰۰ فساد ہوئے۔ لاکھوں مسلمانوں کو گھر میں گھس کر بے رحمی سے قتل کیا، اس پر بھی ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو وزیر اعظم اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں کے ساتھ جس درندگی کا اظہار کیا وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے لیکن سکھوں کی اجتماعیت نے حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ سکھوں کے نقصان کا تین گنا معاوضہ دینا پڑا، جانی نقصان کا الگ سے۔ جب کہ اس فساد میں ۵۰۰۰ سکھ پنجابی مارے گئے تھے لیکن مسلمان ۵۰ سال میں ۱۲۰۰۰ فساد میں لاکھوں کی تعداد میں مارے گئے، اربوں روپیوں کی ملکیت جل کر راکھ ہو گئی۔ کیا حکومت نے آج تک مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان کا معاوضہ ادا کیا اور نہ کبھی کرے گی۔

۸۔ اس وقت سارے عالم میں ملت کے اندر بیداری پھیل رہی ہے لیکن ہم ہندوستان کی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ہماری پریشانیاں یہیں پیدا ہوئی ہیں اور ہمیں اسی جگہ ان کو حل کرنا ہے۔ اس لئے ہم ہندوستان کے پس منظر میں بحث کرتے ہیں۔ آج ہندوستان کا کیا عالم ہے آپ بخوبی دیکھ رہے ہیں۔ ہندوستان کی سیاست اس وقت بدنامی کے اس دور سے گزر رہی ہے جہاں اس سرزمین پر تمام نامور لیڈروں کا مستقبل تاریکیوں میں ڈوب رہا ہے۔ ذات پات، فرقہ وارانہ سیاست آج ہندوستان کی مجبوری بن گئی ہے۔ اب کوئی بھی لیڈر کوئی بھی پارٹی ذات پات کا سہارا لئے بنا اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر مسلم لیڈروں کو ایکسرے کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان میں تین طبقہ نظر آتا ہے۔ پہلا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو غیر مسلم پارٹیوں میں شریک ہیں اور ان کی نکیل سربراہان اقتدار کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ان کی حیثیت دھوبی کے کتے کی طرح ہوتی ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو خود مختار کی حیثیت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہیں مسلم پارٹیاں ہیں۔ ان کی حیثیت ملت کی آستین میں پلے ہوئے سانپ کی طرح ہے اور تیسرے طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو خانقاہوں میں بیٹھے ملت کو گمراہ کر رہے ہیں۔

جس وقت بابری مسجد شہید کی جا رہی تھی اس وقت دار الکفر کے ممبران پارلیمنٹ میں تقریباً ۵۵ مسلم تھے۔ ان میں آدھے سے زیادہ کانگریس آئی میں تھے اور کئی ممبران تو منسٹر تھے۔ کانگریس کے دور حکومت میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ بروز اتوار وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے منحوس زیر سایے بابری مسجد کو ناجائز طاقت کے بل پر شہید کی گئی اور ہمارے ۵۵ مسلم سورما ممبران بھیگی بلی بنے پونچھ دبائے کھونٹے سے بندھے اپنے کافر آقاؤں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

۹۔ بابری مسجد کی شہادت کے صدقے میں ہندوستان میں فساد کا ایک زبردست خونریزی دور شروع ہوا اور بمبئی بم دھماکے پر حکومت نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے حفاظتی قوائد کے ذریعے اسے مسلمانوں کے قتل گاہ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا اور تمام مسلم رہائشی اور صنعتی علاقوں کو روند ڈالا۔

۱۰۔ ہندوستان کی سرزمین ایک ایسی سرزمین ہے جہاں کی پیدا ہوئی نسلوں میں یہ تاثیر ہے کہ یہ باہر سے آنے والی تمام طاقتور تحریکیوں کے اقتدار کو بہت آسانی سے تسلیم کر لیتی ہے۔ پانچ ہزار سالہ تاریخ ہند سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یہاں کی عوام ذہنی طور پر بہت کمزور تھی۔ جب سے اسلامی سسٹم کا دخل اس سرزمین پر ہوا مسلمانوں کے ساتھ رہ کر ان میں غیرت پیدا ہوئی۔

۱۱۔ آج ہندوستان میں ہمیں جو ماحول فراہم ہے یہ ٹوٹل انٹی اسلام ماحول ہے۔ اسلام

اور مسلمانوں کی مخالفت کرنے والی تمام تنظیمیں جس طرح منظم ہو رہی ہیں اور ہندتووادی تنظیمیں سرعام جس طرح طاقت کا مظاہرہ کر رہی ہیں اور مسلم معاشرہ خاموش نگاہوں سے تمام اسلامی تنظیموں کی طرف جس امید سے دیکھ رہی ہے وہاں اسے کوئی حرارت نظر نہیں آتی۔ ملکی سطح پر ملت کے اندر ایک ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ مسلم معاشرے کا کوئی بھی فرد ہندوستان کے کسی کونے میں ہو، کسی بھی پیشے میں ہو ہر جگہ مسلم ہونے کی وجہ سے ان کو کمتری کا احساس کرایا جاتا ہے۔ مسلم ہونے کی وجہ سے ہر جگہ ان کے ساتھ بھید بھاؤ ہونا ضروری ہے۔ چاہے یہ کتنا بھی ان کے وفادار بن جائیں پھر بھی ان کے ساتھ دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے سلوک کریں گے۔

۱۲۔ آج ہندوستان کا نظام جس سسٹم پر کھڑا ہے وہ فیل ہو چکا ہے۔ یہاں کی اتھارٹی بالکل ناکارہ ہو گئی ہے۔ لاء اینڈ آرڈر صرف فائلوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ ہندوستان میں ایک طرف ظلم و ستم کا سمندر لہریں مار رہا ہے تو دوسری طرف مہنگائی کا اژدہا شریف عوام کو نگلنے کے لئے منہ کھولے کھڑا ہے وہیں تیسری طرف فاشزم طاقتیں اپنا خونی پنجہ پھیلائے ہوئے ہے۔ چوتھی طرف گروہ بند مافیا قہر برپا کرنے کو تیار بیٹھی ہے۔ عوام ان کے بیچ میں پھنسی پنجڑے میں قید پرندے کی طرح آزاد ہونے کے لئے پھڑپھڑا رہی ہے۔ یہاں عدل و انصاف کو سیکولرازم نے دیمک کی طرح چاٹ لیا، تہذیب و تمدن کا خون کمیونزم نے جونک کی طرح چوس لیا، غیرت اور انسانی کردار کو سوشلزم نے اژدہا کی طرح نگل لیا اور نیشنلزم انسانیت کے گلے میں لعنت کی طوق ڈال دیا گیا۔ ایک بار پھر ہندوستان کو انقلاب کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اور انقلاب وہی شخص لا سکتا ہے جو اخلاص اور کردار کا مالدار ہو۔ جزا اور سزا پر مکمل ایمان رکھتا ہو اور ایسی صلاحیت والی شخصیت کو صرف ملت اسلامیہ ہی پیدا کر سکتی ہے۔

۱۳۔ اس وقت ہندوستان میں کئی اسلامی آرگنائزیشن کام کر رہے ہیں۔ سب کے پاس اپنا دستور ہے، اپنے اصول ہیں اور ساتھ ہی سب کی ایک محدود سرحد ہے۔ اسی طرح اسلامی لیڈروں کی ایک جماعت اس سرزمین پر موجود ہے، لیکن کس کام کی؟ ان سب آرگنائزیشن اور لیڈروں کا مقصد اسلام کی کامیابی اور ملت کی فلاح ہے اس کے باوجود آج ۵۰ سالوں سے اس سرزمین پر اسلام کو کتنی کامیابی حاصل ہوئی؟ برخلاف اس کے ملت اور پستی میں چلی گئی۔ اس پچاس سال کی آزادی میں آج ہندوستان کا دارالکفر گولڈن جوبلی منا رہا ہے۔ کیا ملت کو بھی پچاس سالہ غلامی کی گولڈن جوبلی منانی چاہیے؟

افسوس صد افسوس! ملت اسلامیہ کا اللہ ایک، رسول ایک، دستور قرآن ایک پھر آپس میں خلفشار اور نا اتفاقی کیوں؟ تمام تنظیمیں اور تمام لیڈر ایک پلیٹ فارم پر ایک بینر کے نیچے کیوں نہیں ہیں؟ ان پچاس سال کے اندر کوئی بھی تحریک ملت کے اندر مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور نہ کوئی لیڈر مقبولیت حاصل کر سکا۔ ایسی کیا وجہ ہے جو کسی بھی تحریک یا کسی لیڈر کو اتحاد المسلمین تک نہیں پہنچنے دیا اور نہ ملت کے اندر ان کو مقبولیت حاصل کرنے دیا۔

۱۴۔ ایسے ماحول میں اس سرزمین پر جتنی تنظیمیں اور لیڈر ملت کے لئے کام کر رہے ہیں سبھی اپنے آپ کو امارت کے قابل سمجھ رہے ہیں لیکن کوئی تحریک یا لیڈر ملت کی پریشانیوں کو نہ سمجھ سکا اور نہ ہی کوئی حل پیش کر سکا۔ ملت کی ضرورت پر کبھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کیا۔ آج ملت ایک پشت پناہ کی تلاش میں بھٹک رہی ہے، ایک سرپرست کو ڈھونڈ رہی ہے۔ آج ملت اسلامیہ کی حیثیت اس بھگوڑی فوج کی طرح ہے جس کا کوئی سپہ سالار ہی نہیں ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ جو تنظیمیں موجود ہیں وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہیں، وہ اپنی سطح پر کام کر رہی ہیں لیکن اپنی محدود سرحدوں کے اندر، اس لئے ان کو ملت کے اندر مقبولیت حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ آخر کب تک یہ تمام تنظیمیں انفرادی حیثیت سے زندہ رہیں گی؟ کیا ان کو اجتماعیت سے پرہیز ہے یا ان کو اجتماعیت کی طاقت کا احساس نہیں ہے؟

۱۵۔ ملت چاہتی ہے کہ یہ تمام تنظیمیں ایک پلیٹ فارم پر ایک بینر تلے ایک امیر ملت پر بیعت کرے نہ کہ جماعت اسلامی، ایس آئی ایم، یا ملی کونسل، احرار پارٹی یا انفرادی حیثیت سے ملی پارلیامنٹ بنائی جائے بنسبت اس کے اجتماعی حیثیت سے "اسلامی پارلیامنٹ" کی بنیاد رکھی جائے اور اس کے تحت منسٹریٹ لکی حیثیت سے تمام تحریکوں سے مستحکم ڈھنگ سے کام لیا جائے اور ملت کی تمام تر پریشانیوں اور ضرورتوں پر غور و فکر کر کے اسلامی سسٹم کے تحت اس کا حل پیش کیا جائے۔ ملت کی تمام تر سہولیت اور صلاحیت کو دارالکفر میں ہو رہے ناجائز استعمال کو روکا جائے، تمام مسلم سرمایہ داروں کو ایک مستحکم اسلامی انڈسٹریل امپائر مہیا کیا جائے، اسلامی بینکنگ سسٹم کو فروغ دیا جائے اور صلاحیت اسلامی طرز عمل پر استعمال کرنے کے لئے ایک "متوازی حکومت" قائم کی جائے اور اس کے ساتھ ایک بیوروکریسی کی بنیاد ڈالی جائے تاکہ ملت کو ایک واحد خدا کے دستور اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہونے کے لئے ماحول فراہم کیا جا سکے، جو بھی تنظیم یا لیڈر اسلامی امپائر کی مخالفت کرے اس کے بارے میں اس کی زندگی کا ایکسرے کر کے اس کی آئیڈیالوجی ملت کے سامنے بے نقاب کیا جائے اور تمام علماء اسلام اس کے خلاف فتویٰ جاری کریں۔ ملت کے اندر اس قسم کی جتنی بھی کالی بھیڑیں ہیں ان کو کھینچ کر باہر نکالا جائے۔ اگر ملت کے اندر سے ڈر اور خوف کو اب بھی نہ نکالا گیا اور ملت راہ راست پر نہ آ سکی تو اب وہ دن دور نہیں جب دوسرا "اسپین" دنیا کے سامنے رونما ہو گا۔ اگر تمام لیڈر اور تنظیموں کو اقتدار وقت کا خوف اسی طرح سر پر سوال رہا اور یہ اپنی بند کمروں میں کچھ اور اسٹیج پر کچھ کی پالیسی میں تبدیلی نہیں لائے تو اقدامی پہلو کی بات تو دور ہم دفاعی پہلو کے لائق بھی نہ رہیں گے۔

میں ملت کے تمام قاید اور تمام تحریکیوں کے تمام عہدیدار اور سربراہوں سے تہہ دل سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کی مخالفت میں زبان نہ کھولیں اور نہ ہی ایسا کوئی لٹریچر تیار کریں جس سے ملت میں خلفشار پیدا ہو اور نا اتفاقی کی کھائی سمٹنے کے بجائے پھیلتی چلی جائے۔

محمد نسیم خان۔ الہ آباد

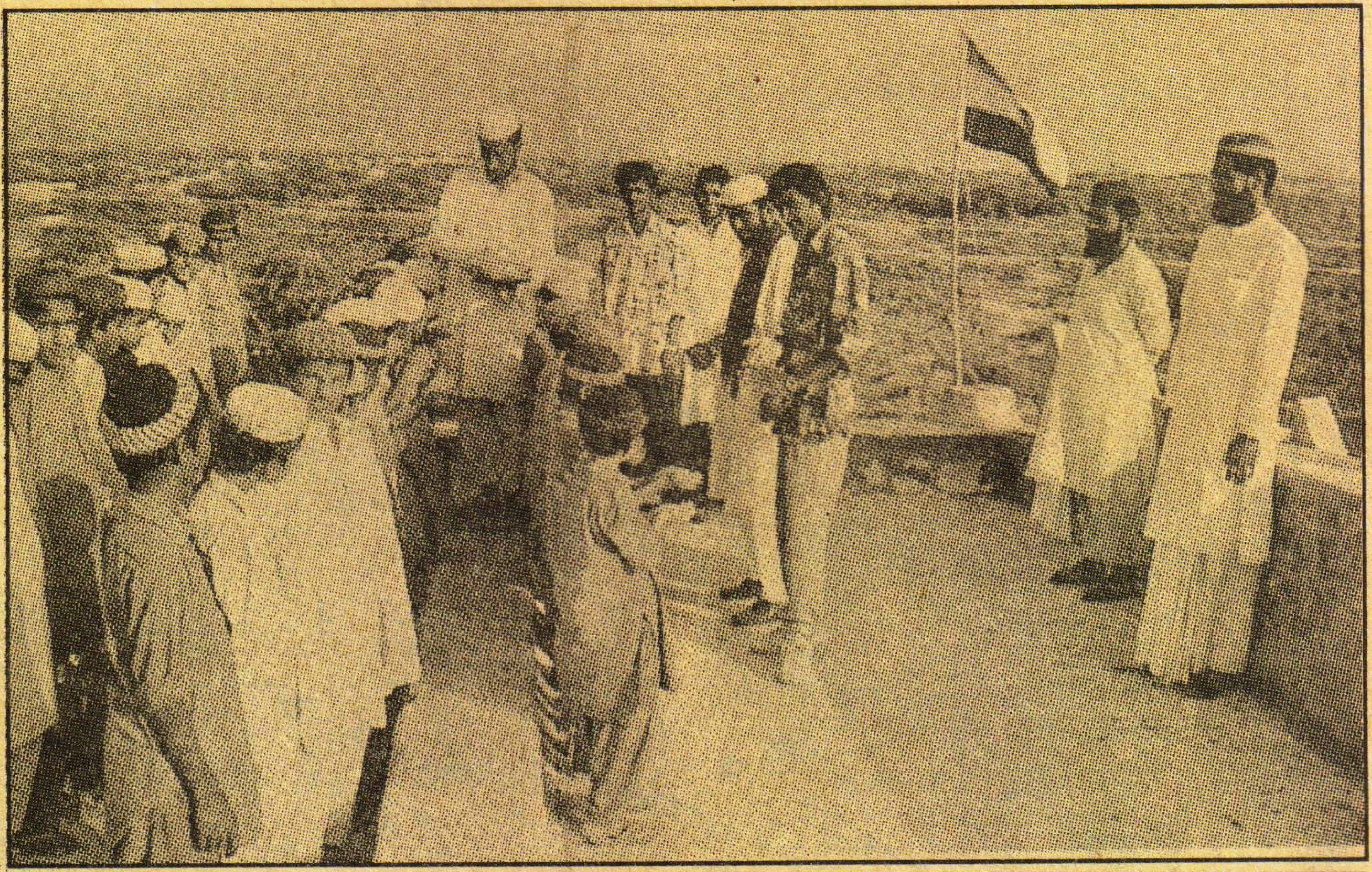
مدارس، مسلمان اور آئی ایس آئی

ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف اب دوسرے مرحلے کا آغاز ہو چکا ہے

ہندوستانی مسلمانوں کے گرد دشمنوں کا گھیرا مسلسل سخت ہوتا جارہا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان یہ احساس عام ہوا ہے کہ دشمنوں کی اسکیم نہ صرف یہ کہ کارگر ہے بلکہ اب تو باحوصلہ مسلمانوں میں بھی مدافعت کا کس بل جاتا رہا ہے۔ اچھے خاصے باحوصلہ لوگ بھی اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ایک ہاری ہوئی جنگ کو مزید اسی بے بسی کے ساتھ لڑتے رہنا ممکن نہیں۔ اگر اس صورت حال پر روک لگانے کی فوری کوشش نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے حوالے سے وہی صورت حال پیش آئے جس کی ایک جھلک ہم مسلم اسپین کی تاریخ میں دیکھ چکے ہیں۔

سب سے پہلے تو اس ملک میں ایک آزاد مسلم سیاسی فکر کا گلا گھونٹا گیا، مسلمانوں کو یہ باور کرایا گیا کہ اس ملک میں علیحدہ مسلم سیاسی شناخت سے ان کی زندگی کے لالے پڑ جائیں گے، اس لئے اگر انھیں زندہ رہنا ہے تو اپنی حفاظت کی ذمہ داری اور امت کی نگہبانی کا کام کفار و مشرکین کے ہاتھوں سونپ کر مطمئن ہو جائیں۔ قرآنی نظام عدل کا ایجنڈا لپیٹ کر رکھ دیں اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی نظام کے استحکام کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں اس میں شامل ہو جائیں۔ انھیں حکومت کے مناصب بھی ملیں گے، گورنری اور صدارت عظمی کے عہدوں پر بھی انھیں فائز کیا جائے گا، شرط بس اتنی ہے کہ وہ ہماری ڈھب کے مسلمان ہوں۔ رہے وہ لوگ جن کے لئے دین وایمان کو کھلے عام بیچ دینا ممکن نہیں تو انھیں چاہیئے کہ وہ دعوت وارشاد کے حوالے سے مدارس قائم کریں، خانقاہیں آباد کریں کہ ایسا کرنے کی انھیں دستوری طور پر اجازت دی جائے گی۔

عرصہ گزرا دین اور شریعت کے حوالے سے مخلص مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ مدارس کی چار دیواریوں کے اندر ایک پرسکون اسلامی زندگی کے مزے لوٹتا رہا۔ اسے اس بات کی بہت کم فکر رہی کہ اس نظام جبر میں عام مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے، زندگی کے ہر مرحلے میں، سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات کے موقع پر عام مسلمانوں کو کن تکلیف دہ صورت حال سے گزرنا پڑتا ہے۔ سیکولرزم کے قالب میں مشرکانہ ثقافت کس طرح رفتہ رفتہ عام مسلمانوں کی زندگی میں گھلتی جارہی ہے۔ جن لوگوں نے مدارس کی چار دیواریوں میں پناہ لے رکھی تھی انھوں نے اتنا بھی نہ کیا کہ عام مسلمانوں کو غیر اسلامی رسوم واقدار سے دامن بچانے کے لئے کوئی رہنمائی فراہم کرتے، نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلمانوں نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ سے صورت حال کا مقابلہ کیا۔ بہت سے لوگ جو کم حوصلہ تھے رفتہ رفتہ نظام جبر کے رنگ میں کچھ اس طرح رنگ گئے کہ ان کی اسلامی شناخت پھیکی پڑ گئی۔ جو باحوصلہ تھے انھوں نے سرکاری



”بھارت ماتا“ کی یوم آزادی پر ایک دینی مدرسے میں مٹھائیوں کی تقسیم کا ایک ”روح پرور“ منظر

نوکریوں کو خیرباد کہا اور اپنے لئے ایک نئی دنیا آباد کرنے کی کوشش کی یا پھر غیر ممالک کو ہجرت کر گئے۔

رفتہ رفتہ ہندوستانی مسلمانوں میں دینی اور دنیاوی مسلمانوں کی تفریق بڑھتی گئی۔ جو لوگ دنیا کی راہ پر چل نکلے تھے اور جو زندگی کی ہماہمی میں شامل سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں اپنا مستقبل دیکھتے تھے، ان کے لئے دین پر چلنا ممکن نہ رہا اور جو لوگ دین و شریعت کے علمبردار تھے وہ اپنے آپ کو مدارس کی چار دیواریوں کے باہر Irrelevant (ناکارہ) محسوس کرتے تھے۔ دنیاداروں کے لئے اسلام ایک ناقابل عمل تصور تھا اور بے چارے دین داروں کا وجود ہی موجودہ ہندوستان میں ناقابل عمل بن گیا تھا۔

نظام جبر نے تو پہلے مرحلے میں یہ کوشش کی کہ عام مسلمانوں میں دین پر عامل ہونے کا احساس ختم کر دیا جائے، یہ تصور جاتا رہے کہ الٰہی شریعت پر عمل کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے۔ دیکھا جائے تو نظام جبر اپنے اس پروگرام میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔ اب عام مسلمانوں کو یہ خیال مشکل ہی سے آتا ہے کہ اسلامی زندگی کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اتباع میں پوری طرح گزاری جائے۔ یہ تو ایک مرحلے کی کامیابی تھی جس کے بعد اب دوسرے مرحلے کا آغاز ہو چکا ہے۔

دین کے نام پر اسلام کی تھوڑی بہت شد بد جو مدارس کی چار دیواریوں میں محدود تھی اب اس کے خلاف ایک منظم جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں قومی پریس میں تواتر کے ساتھ یہ باتیں آتی رہی ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم گاہیں، دینی ادارے اور مسجدوں میں چلنے والے مکاتب، یہ سب کے سب دراصل پاکستان کے خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے ٹھکانے ہیں اور یہ کہ ان مدارس

دین کے نام پر اسلام کی تھوڑی بہت شد بد جو مدارس کی چار دیواریوں میں محدود تھی اب اس کے خلاف ایک منظم جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں قومی پریس میں تواتر کے ساتھ یہ باتیں آتی رہی ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم گاہیں، دینی ادارے اور مسجدوں میں چلنے والے مکاتب، یہ سب کے سب دراصل پاکستان کے خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے ٹھکانے ہیں۔

سے ملک کے تحفظ کو سخت خطرہ ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں ملک کے مختلف دینی اداروں میں اسی بہانے سے معصوم بے بس مسلمانوں کو حراساں کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں بنگلہ دیشی دراندازوں کے حوالے سے دارالعلوم دیوبند اخبارات کا موضوع بنا رہا ہے اور زیادہ پرانی بات نہیں جب رات کی تاریکی میں پولیس کے نوجوان آئی ایس آئی ایجنٹ کی تلاش میں ندوۃ العلماء کے کیمپس میں پہنچی تھی۔ یہ تو ملک کے معروف و محترم اداروں کا حال ہے۔ چھوٹے چھوٹے مدارس میں مسلم طلباء اور اساتذہ پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ ابھی گذشتہ دنوں وزارت داخلہ میں بحث و تمحیص کے حوالے سے یہ اطلاع بھی سامنے آئی ہے کہ پاکستانی خفیہ ایجنسی سرحدی علاقوں میں بہت سے دینی مدارس کے قیام کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح کی باتوں سے اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ اب حکومت ہر دینی مدرسے پر خصوصی نگاہ رکھنا چاہتی ہے۔ گویا امت کے چند ٹوٹے پھوٹے نفوس جو اب تک تعلیم و تعلم کے حوالے سے سرگرم


جانب من المبنى المركزي للجامعة

تھے ان کے لئے بھی آنے والے دن سخت تر ثابت ہوں گے۔

مسلمانوں کے خلاف دوسرے مرحلے کی کوششوں میں اس بات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ اب تک جو لوگ دین و مذہب کے حوالے سے بھلی بری کوشش اس ملک میں جاری رکھے ہوئے ہیں ان کی راہ میں اتنی دشواریاں پیدا کر دی جائیں کہ کم حوصلہ لوگوں کے لئے یہاں بھی پناہ لینی مشکل ہو جائے۔ رہے باحوصلہ اور مہم جو قسم کے لوگ تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی اور انھیں اگر بھیڑ سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا گیا تو ان کا بہت زیادہ دنوں تک چلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اب حکومت کے پالیسی ساز دبی زبانوں سے اس خواہش کا اظہار کرنے لگے ہیں کہ ایک قومی تعلیمی پالیسی کی راہ میں اقلیتی اداروں کی خصوصی اجازت رکاوٹ بن گئی ہے۔ اس خیال کے حاملین کہتے ہیں کہ اقلیتی اداروں میں چونکہ قومی نصاب تعلیم سے ہٹ کر جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ عام قومی ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔ تعلیمی اصلاح کے نام پر بعض حلقے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں بالخصوص دینی مدارس سے خصوصی نصاب کا حق چھین لینا چاہتے ہیں۔ تعلیمی پالیسی سازوں میں اب یہ خیال بھی پرورش پا رہا ہے کہ اقلیتی تعلیمی ادارے اگر قومی پالیسی کی راہ میں رکاوٹ ہوں تو دستور کی دفعہ ۲۹ اور ۳۰ پر از سر نو غور کیا جانا چاہئے۔ یعنی دستوری اور غیر دستوری ہر سطح پر یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے دینی اداروں اور تعلیم گاہوں کا وجود ختم ہو جائے۔

صورت حال انتہائی سنگین ہے لیکن افسوس کہ اس کی نزاکت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے۔ ایک کے بعد دوسرا ادارہ دشمنوں کی زد پر ہے لیکن مسلمانوں میں اس صورت حال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا۔ حتی کہ وہ ادارے بھی جو ان حملوں کی مسلسل زد میں ہیں وہاں بھی صبر و سکون کی تلقین جاری ہے۔ مسئلہ حیدر آباد کے چھوٹے مدارس اور مساجد سے شروع ہو کر ندوۃ العلماء میں پولیس ایکشن تک پہنچا اور اب گذشتہ چند ماہ سے دار العلوم دیو بند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمن کو اپنی بے گناہی کی مسلسل قسم کھانی پڑ رہی ہے، لیکن زہریلے پروپیگنڈے کا یہ طوفان رکے نہیں رکتا۔ اس سے بھی سنگین بات یہ ہے کہ

اقلیتی اداروں میں چونکہ قومی نصاب تعلیم سے ہٹ کر جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ عام قومی ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔ تعلیمی اصلاح کے نام پر بعض حلقے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں بالخصوص دینی مدارس سے خصوصی نصاب کا حق چھین لینا چاہتے ہیں۔

صورت حال انتہائی سنگین ہے لیکن افسوس کہ اس کی نزاکت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے۔ ایک کے بعد دوسرا ادارہ دشمنوں کی زد پر ہے لیکن مسلمانوں میں اس صورت حال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا۔

اس مہم کے خلاف امت میں کسی مشترکہ لائحہ عمل کا احساس نہیں پایا جاتا۔ اہل ندوہ اس بات سے مطمئن ہیں کہ ندوہ میں پولس ایکشن کے بعد مرکزی حکومت نے اپنے ایک مسلمان وزیر کو معافی تلافی کے لئے بھیجا تھا جس نے انھیں آئندہ ایک پر سکون زندگی کی ضمانت دی تھی۔ وہ اس زبانی وعدے سے اتنے مطمئن ہوئے کہ اس کے بعد امت کے بعض گوشوں سے اس مسئلے پر ایک مشترکہ لائحہ عمل وضع کرنے کی تجویز آئی تو ذمہ داران ندوہ کی طرف سے اس تجویز کی مخالفت ہوئی۔ پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ میں ندوہ کے ذمہ داروں نے تو یہاں تک کہا کہ یہ ندوہ کا اندرونی مسئلہ ہے اس سے ہم خود نمٹ لیں گے۔ تب وہ اس بات کے ماننے پر تیار نہ تھے کہ امت کا ایک عام فرد اور ٹوٹے پھوٹے مفلوک الحال دردمند مسلمانوں کو کسی وزیر کی زبانی یقین دہانی پر ترجیح نہیں دینا چاہیئے کہ حکومتوں میں زبانی وعدوں اور شخصی یقین دہانی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

اہل ندوہ فوری طور پر خود کو مامون و محفوظ محسوس کرتے ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک کے بعد دوسرا ادارہ دشمنوں کی زد میں آتا گیا تو دیر یا سویر کسی کا اس حملے سے بچا رہنا ممکن نہ ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم محض اپنی ناکوں کے آگے دیکھنے کے بجائے اردگرد دیکھنے کی عادت ڈالیں۔ ہندوستانی مسلمان جس بے بسی اور مفلوک الحالی کی زندگی میں مبتلا ہیں ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر چھوٹے بڑے ادارے کی حفاظت کی جائے۔ ہم اس احساس سے خالی نہ ہوں کہ ملک میں سرگرم ہر دینی جماعت ہمارے ہی وجود کا حصہ ہے۔ اگر اس میں سے کوئی حصہ ضائع ہو گیا تو اس کی زک براہ راست ہماری ذات پر پہنچے گی۔ ہم آپس میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھتے ہوں دشمن کے مقابلے میں ہمیں ایک مشترکہ اور متحدہ موقف اختیار کرنا ہوگا، ورنہ ہوگا یہ کہ ایک کے بعد دوسرے ادارے تباہ ہوتے جائیں گے۔ ایک جماعت کے بعد دوسری جماعت پر دشمنوں کا عتاب نازل ہوگا اور خود جب ہماری جماعت یا ہمارا ادارہ اس کی زد میں آئے گا تو ہماری حمایت میں کوئی آواز نہ اٹھ سکے گی۔ اس لئے کہ تب خود ہماری آواز ہی آخری آواز ہوگی۔

پردہ مگر کس حد تک؟

اسلام کو کیا مطلوب ہے؟ ... جلباب یا برقع ملفوف

پردے کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ یہ اسلام کا ایک حکم تو ضرور ہے البتہ یہ فی زمانہ قابل عمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن گھروں میں پردے کا چلن رفتہ رفتہ اٹھتا گیا ہے اور جہاں اب آزاد مخلوط ماحول کے اقدار رائج ہوگئے ہیں وہاں بھی پردے کے بارے میں نظری طور پر کسی باغیانہ رویے کا اظہار نہیں ہوتا۔ البتہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اگر ہمیں فی زمانہ بھاگتی دوڑتی زندگی پر اپنی گرفت بنائے رکھنی ہے تو پردے کے ساتھ یہ کام انجام پا نہیں سکتا۔ جس طرح بہت سے مسلمان اسلامی نظام کے بغیر اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن سمجھتے ہیں اسی طرح ہماری بہت سی بہنیں بھی احکام حجاب کی پابندی کے بغیر کامیاب دینی اور دنیوی زندگی کی تشکیل میں مصروف نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن گھروں سے پردے کے مظاہر غائب ہوگئے ہیں وہاں بھی عبادت کا ذوق و شوق اور اپنی آخرت کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا پروگرام ضرور پایا جاتا ہے۔

پھر عام ذہنوں میں پردے کا جو مفہوم پایا جاتا ہے وہ بھی اتنا متضاد اور مختلف ہے کہ عام مسلم خاتون کے لئے یہ فیصلہ کرنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کا مطلوبہ پردہ کون سا ہے۔ جو خواتین ترک پردہ کے مراحل سے گذر کر اب زندگی کی ہماہمی میں دور تک نکل آئی ہیں ان کے اندر کبھی اللہ اور اس کے رسول کے حوالے سے احکام حجاب پر عمل کا داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے تو وہ یہ سوچ کر اس خیال کو ترک کر دیتی ہیں کہ مروجہ سخت قوانین حجاب کی پابندی ان کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ پردے کے نام پر جو جامد تصوراتی روایات ہمارے معاشرے میں رائج ہیں وہ بہر حال کسی دوڑتی بھاگتی زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم خواتین میں جوں جوں گھر سے باہر نکلنے کا رواج بڑھتا جاتا ہے اسی قدر پردے کا رواج ہماری سوسائٹی سے اٹھتا جاتا ہے۔ (جو لوگ اس وقت پردے پر عامل ہیں یا اس کی حمایت میں دلیل لاتے ہیں وہ بھی انتہا پسندی کا شکار ہیں۔ اور جو لوگ سارے حدود سے آزاد ہو کر مادی زندگی کی دوڑ دھوپ میں حجاب کے احکام الٰہی سے دور نکل آئے ہیں وہ بھی راہ حق سے بھٹک گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم خواتین کو دوبارہ مسلم معاشرے میں واپس لایا جائے اور مسلم معاشرہ اپنے دامن میں اتنی وسعت پیدا کرے کہ ہماری بہنیں غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی معاشرے کی آغوش میں فکر و عمل کی کہیں زیادہ آزادی محسوس کر سکیں۔ (اور قرن اول کی طرح دبی کچلی خواتین اسلامی معاشرے کے دامن میں پناہ لے سکیں) اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب مسلم معاشرہ مسلم خاتون کو وہ سب کچھ دے دے جو اللہ اور اس کے رسول نے عطا کیا ہے اور جسے رفتہ رفتہ بعد کے مسلم معاشرے نے سلب کر لیا ہے۔



پردہ مسلم خواتین کی آزادی کی علامت ہے۔ جلباب مسلم خواتین کو صرف احساس تحفظ عطا نہیں کرتا بلکہ یہ اس بات کا اعلان بھی ہے کہ حجاب کی شرعی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے مسلم خاتون ملی زندگی کی تعمیر میں ایک سرگرم رول ادا کر سکتی ہے۔ یہ گویا اس بات کا اعلان ہے کہ اسلام نے مرد اور عورت کو یکساں مواقع دیے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لئے، ایک صالح معاشرہ کے قیام کے لئے، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو انجام دینے کے لئے جو کچھ بن پڑے ضرور کرے۔ البتہ گھروں سے باہر سماجی زندگی میں مرد اور عورت دونوں کے لئے بعض رہنما اصول متعین کئے گئے ہیں تاکہ جو لوگ ایک صالح معاشرے کے قیام کے لئے شب و روز سرگرم ہوں وہ کسی بشری وساوس کے شکار نہ ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ جو لوگ اللہ کی رضا کے لئے گھروں سے نکلے ہوں ان کے سماجی تعامل سے کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جو کامیابی کے بجائے خسارے کی طرف لے جاتی ہو لہذا اہل ایمان کے

لئے حکم ہے۔

"مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کریں۔"

اسی طرح مومن عورتوں سے بھی یہ کہا گیا کہ

"وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔"

البتہ ان سے مزید مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنی ڈال لیا کریں اور اپنے پاؤں اس طرح زمین پر مارتی نہ چلیں کہ ان کی چھپی ہوئی زینت کا برسرعام اعلان ہو۔ گویا مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی چلت پھرت بعض خصوصی احکامات کے تابع ہے۔ پھر اس سلسلے کی بعض دوسری آیات میں اس بات کی صراحت بھی کردی گئی ہے کہ گھروں سے باہر اپنی زینت کو چھپانے کے لئے مسلم خواتین کیا طریقہ اختیار کریں؟ گھر کے اندر خمار یعنی چھوٹی اوڑھنی کا استعمال کافی سمجھا گیا۔ البتہ گھر سے باہر نکلنے کے لئے بڑی چادر یعنی جلباب کی شرط عائد کردی گئی۔ رہی یہ بات کہ مسلم خواتین کا گھروں سے کب نکلنا مناسب ہے اور کب نامناسب؟ یا کون سا کام ضروری حاجت میں شمار کیا جائے گا اور کون سا غیر ضروری؟ تو اس بارے میں کوئی خط تنسیخ نہیں کھینچی گئی ہے بلکہ یہ لوگوں کے اپنے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس بات کا فیصلہ کریں کہ ایک پاکیزہ اسلامی معاشرے کے قیام میں ان کی کس قدر چلت پھرت معاون ہو سکتی ہے اور کس قسم کی سرگرمی سے معاشرے کے تقدس کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ گویا اسلام کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلم معاشرے کو خود یہ طے کرنا ہے کہ وہ ایک بہتر اسلامی معاشرے کی تشکیل میں مسلمان مرد و عورت سے کب کس طرح کی سرگرمی کا طالب ہے؟ مسلم معاشرے کی بدلتی ضرورتوں کے تحت مرد و عورت سے مطالبات بھی بدل سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی ہنگامی صورت حال میں محاذ جہاد پر مردوں کی قوت ناکافی ہو گئی ہو یا اسلامی معاشرے کو دشمنوں کی زد سے بچائے رکھنا صرف مردوں کے بس کی بات نہ ہو تو ایسی صورت میں مسلم خواتین پر اضافی ذمہ داری عائد ہو جائے گی۔ سماجی اور سیاسی

کسی بڑے سے بڑے فقیہ وقت کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ قرآن کی صریح احکامات کے باوجود اس میں اپنی طرف سے کوئی نرمی پیدا کرے اور نہ ہی کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حجاب کے سلسلے میں مسلم خواتین سے جس قدر مطالبہ کیا ہے اس پر اپنی طرف سے کوئی اضافہ کرے۔

پردہ مسلم خواتین کی آزادی کی علامت ہے۔ جلباب مسلم خواتین کو صرف احساس تحفظ عطا نہیں کرتا بلکہ یہ اس بات کا اعلان بھی ہے کہ حجاب کی شرعی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے مسلم خاتون ملی زندگی کی تعمیر میں ایک سرگرم رول ادا کرسکتی ہے۔

ضرورتیں مرد اور عورت کے نئے رول کی تشکیل کریں گے۔ ہنگامی حالات میں مسلمانوں پر جس قدر ذمہ داریاں عائد ہوں گی، معمول کی صورت حال میں اس قدر مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ گویا سماجی زندگی میں عورت کا رول ہو یا مرد کا یہ سب کچھ کوئی جامد اور ناقابل تغیر شے نہیں ہے۔ کبھی عورت کا گھر سے باہر متحرک رہنا کار ثواب ہو سکتا ہے تو کبھی گھر کے اندر کی ان ذمہ داریوں کو ادا کرنا قابل ترجیح ہوگا جس سے صرف نظری چہار دیواری کے سکون کو برباد کرسکتی ہے۔

اسلام چونکہ ہر دور کے لئے ایک قابل عمل نظام فراہم کرتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کی عائد کردہ اخلاقی پابندیاں اور اختلاط مرد و زن کے حدود ہمارے عہد کے لئے قابل عمل نہ ہوں۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اگر اسلام مسلم خواتین سے احکام حجاب کی پابندی کا طالب ہے تو اسے ہر زمانے میں دنیا کے ہر ملک میں قابل عمل سمجھا جائے گا۔ کسی بڑے سے بڑے فقیہ وقت کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ قرآن کی صریح احکامات کے باوجود اس میں اپنی طرف سے کوئی نرمی پیدا کرے اور نہ ہی کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حجاب کے سلسلے میں مسلم خواتین سے جس قدر مطالبہ کیا ہے اس پر اپنی طرف سے کوئی اضافہ کردے۔

ہمارے خیال میں قرآن نے پردے کا جو تصور قائم کیا ہے اس پر عمل کرنا نہ کل مشکل تھا اور نہ آج ہے۔ مسئلہ وہاں سے پیدا ہوتا ہے جب پردے کے قرآنی احکام کے تشریح و تعبیر میں ہم احتیاط کے نام پر اپنی عقل سے کچھ اضافہ کردیتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ دین میں غلو سے سخت منع کیا گیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "دین میں غلو سے بچو اس لئے کہ اس سے پہلے کی قومیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔" ہمیں یہ بات بھی یاد رہنی چاہئے کہ ومن یتعد حدود اللہ فاولئك هم الظالمون۔

قرآن کا مطلوبہ پردہ

پردے کے سلسلے میں قرآن میں دو طرح کی آیات وارد ہوئی ہیں۔ ایک کا تعلق براہ راست نبی کی ازواج مطہرات سے ہے تو دوسری عام مومن عورتوں کو خطاب کرتی ہے۔ جو آیات ازواج مطہرات سے متعلق ہیں وہاں حجاب کے احکامات

انتہائی سخت ہیں بلکہ قرآن کی جس آیت میں حجاب کا لفظ وارد ہوا ہے جسے عام طور پر آیت حجاب کہا جاتا ہے وہ بھی رسول اکرم کے گھر میں عام مسلمانوں کو آنے جانے کا سلیقہ سکھاتی ہے اور اسی آیت میں مسلمانوں سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب وہ رسول کی بیویوں سے کسی چیز کا سوال کریں تو انھیں چاہئے کہ وہ ایسا پردے کے پیچھے سے کریں۔ اسی آیت میں آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رسول کے بعد کوئی ان کی بیویوں سے نکاح کی جرات نہ کرے کہ ایسا کرنا اللہ کے نزدیک بڑی بات ہے۔ اب آپ پوری آیت خود ملاحظہ کیجئے۔

"اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخلے سے بچو الا یہ کہ تمہیں طلب کیا گیا ہو کھانے پر لیکن وقت سے پہلے نہیں۔ البتہ اگر تمہیں دعوت ملے تو ضرور آؤ پھر جب کھا چکو تو اپنی راہ لو اور باتوں میں نہ لگے رہو کہ ایسا کرنا نبی کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے مگر وہ لحاظ میں کچھ نہیں کہتے۔ لیکن اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا اور اگر نبی کی بیویوں سے تمہیں کسی چیز کی طلب ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لئے بہتر طریقہ ہے۔ تمہارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف دو یا ان کے بعد ان کی بیواؤں سے شادی رچاؤ۔ اللہ کی نظر میں یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔"



اس آیت میں بنیادی طور پر تین باتیں بتائی گئی ہیں۔ اولاً رسول کے گھر میں اگر کبھی کھانے پر بلایا جائے تو وہ کس طرح پیش آئیں۔ ثانیاً اگر ازواج مطہرات سے سوال کرنے کی حاجت پیش آجائے تو اس کا طریقہ کیا ہو؟ اور یہ کہ آپ کی بیویوں کے بارے میں کبھی یہ خیال بھی نہ لائیں کہ وہ ان سے شادی کر سکتے ہیں اس لئے کہ ایسا کرنا اللہ کے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ ازواج مطہرات کے لئے من وراء حجاب گفتگو کرنے کی سخت شرط اس لئے ہے کہ وہ کوئی عام عورتیں نہیں ہیں۔

اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو دوسروں سے بات کرنے میں لگاوٹ کا انداز اختیار نہ کرو کہ جس کے دل میں نفاق کا روگ ہو وہ کوئی غلط توقع کر بیٹھے اس لیے سیدھی کھری بات کہو اور اپنے گھروں میں جمی رہو، عہد جاہلیت کی طرح اپنے بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اے اہل بیت! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے تمام آلائشیں دور کر دے اور تمہیں پاک وصاف اور خالص کر دے۔ اور ذکر کرو اللہ کی ان آیات اور حکمت کی ان باتوں کا جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔ بیشک اللہ لطیف بھی ہے اور خبیر بھی۔

انہی آیات سے کچھ پہلے ازواج مطہرات کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن متنبہ کرتا ہے کہ انہیں اس دنیا کی زندگی زیادہ عزیز ہے اور دنیا کی زینت ان کا دامن دل کھینچتی ہے۔ تو اے نبی! ان سے کہو کہ ہم تمہیں بہت کچھ دے دلا کر احسن طریقے سے رخصت کر دیں۔ البتہ اگر انہیں اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی چاہت ہے تو یقیناً اللہ نے ان میں سے نیک عمل کرنے والوں کے لئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

پھر اس بات کی صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ اے نبی کی عورتو! اگر تم میں سے کوئی فواحش کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے سزا دوگنی کر دی جائے گی۔ اور اگر کوئی عمل خیر کی راہ اپناتا ہے تو اس کے لئے اس کا اجر بھی دوگنا ہے اور اس کے لئے رزق کریم الگ سے ہے۔

ظاہر ہے جن لوگوں کے لئے اللہ نے خصوصی اجر کا وعدہ کر رکھا ہو، جن کے نیک اعمال پر دوگنی اجر کی بشارت سنائی گئی ہو ان کے لئے زندگی کا معیار بھی سخت ہو گا۔ خصوصی فضل کے مستحق لوگوں سے خصوصی عمل کی توقع عین فطری ہے۔ پھر یہ احساس بھی دلایا جا رہا ہے کہ تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو اور نہ تمہارا گھر عام گھروں کے مانند ہے۔ یہ وقت کے رسول کا گھر ہے جہاں علم و حکمت کی باتیں بتائی جا رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو دنیا میں دوسرے گھروں کو حاصل نہیں۔ اس غیر معمولی اعزاز کا تقاضا ہے کہ ازواج مطہرات گھروں میں جم کر بیٹھیں اور علم وحکمت کی آیات کا ذکر کریں۔ پیشوائی کے منصب پر فائز اس عظیم فیملی سے اللہ چاہتا ہے کہ ہر طرح کی آلائشیں دور کر دے۔ یہ ہے وہ سخت معیار جو قرآن ازواج مطہرات کے لئے قائم کرتا ہے۔ اب اگر کوئی ان آیات سے دلیل لاتا ہے کہ یہ سب مطالبے ہو بہو عام مسلم خواتین سے بھی ہیں تو اسے چاہئے کہ وہ اس سخت معیار کے نتیجے میں عطا کئے جانے والے دوسرے اجر کی بھی ضمانت دے۔

قرآن کا ایک ابتدائی طالب علم بھی اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ سورہ احزاب میں "نساء النبی" اور "نساء المومنین" کو الگ الگ صراحت کے ساتھ مخاطب کیوں کیا گیا ہے؟ سبب بہت واضح ہے۔ ازواج مطہرات سے ایک مخصوص طرز زندگی کا مطالبہ ہے اور ان کے لئے ان آیات میں خصوصی احکام وارد

ہوئے ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی ذرا سی لغزش بھی بیت رسول کی تقدس کو پامال کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لئے وہ اگر آخرت کی طلبگار ہیں تو خود کو ایک سخت ڈسپلن کا پابند کریں۔ اس کے نتیجے میں صرف دوہرے اجر کی بشارت نہیں بلکہ امہات المؤمنین کا منصب بھی عطا کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں رسول کی وفات کے بعد بھی کسی کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ ان سے شادی کا سوچ سکے۔ اب اگر خصوصیت کے ساتھ "نساء النبی" کو خطاب کرنے والی ان آیات کو عام مومن عورتوں کے لئے قیاس کر لیا جائے تو اس سے ایک مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ پھر اس سوال کا جواب بھی نہیں دیا جا سکے گا کہ آخر اسی سورہ کی بعض آیتوں میں "نساء المؤمنین" کو الگ سے کیوں خطاب کیا گیا ہے۔

اب آیئے ان آیات کی طرف جو عام مومن عورتوں سے خطاب کرتی ہیں اور جہاں تخاطب کا عمومی انداز ہے۔

"اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنے اوپر اپنی چادر ڈال لیا کریں۔ یہ بہتر ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں تکلیف نہ پہنچے اور اللہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔" (الاحزاب۔ ۵۹)

اسی مضمون کی مزید تشریح سورہ نور میں کچھ اس انداز سے ہوئی ہے۔

"مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ بیشک اللہ واقف ہے ان چیزوں سے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور اہل ایمان عورتوں سے کہئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں الا یہ کہ جو خود ظاہر ہو۔ اور یہ کہ اپنے سینوں کو اپنی اوڑھنی سے ڈھک لیا کریں اور اپنی زینت کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں سوائے شوہر، باپ، خسر، سوتیلے باپ، بھائی، بھتیجے، بھانجے (ہم پلہ) عورتیں، غلام یا وہ ماتحت خدمتگار جو عورتوں سے کچھ تعرض نہیں کرتے یا وہ بچے جو ابھی عورتوں کے شعور سے خالی ہوں۔ اور یہ کہ وہ اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ مارتی چلیں کہ کسی کی توجہ ملتفت ہو، ان کی پوشیدہ زینت کی طرف۔ (النور۔ ۳۰،۳۱)

پردے کے سلسلے میں پہلی دو آیات ہیں جن میں مومن عورتوں کے لئے حجاب کے حدود متعین کئے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر ان آیات سے جو احکام بر آمد ہوتے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

(۱) مسلم خواتین کے لئے لازم ہے کہ وہ گھر سے باہر نکلتے وقت اپنے اوپر جلباب ڈال لیا کریں۔

(۲) مومن مرد اور مومن عورت دونوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے عصمت کی حفاظت کریں۔

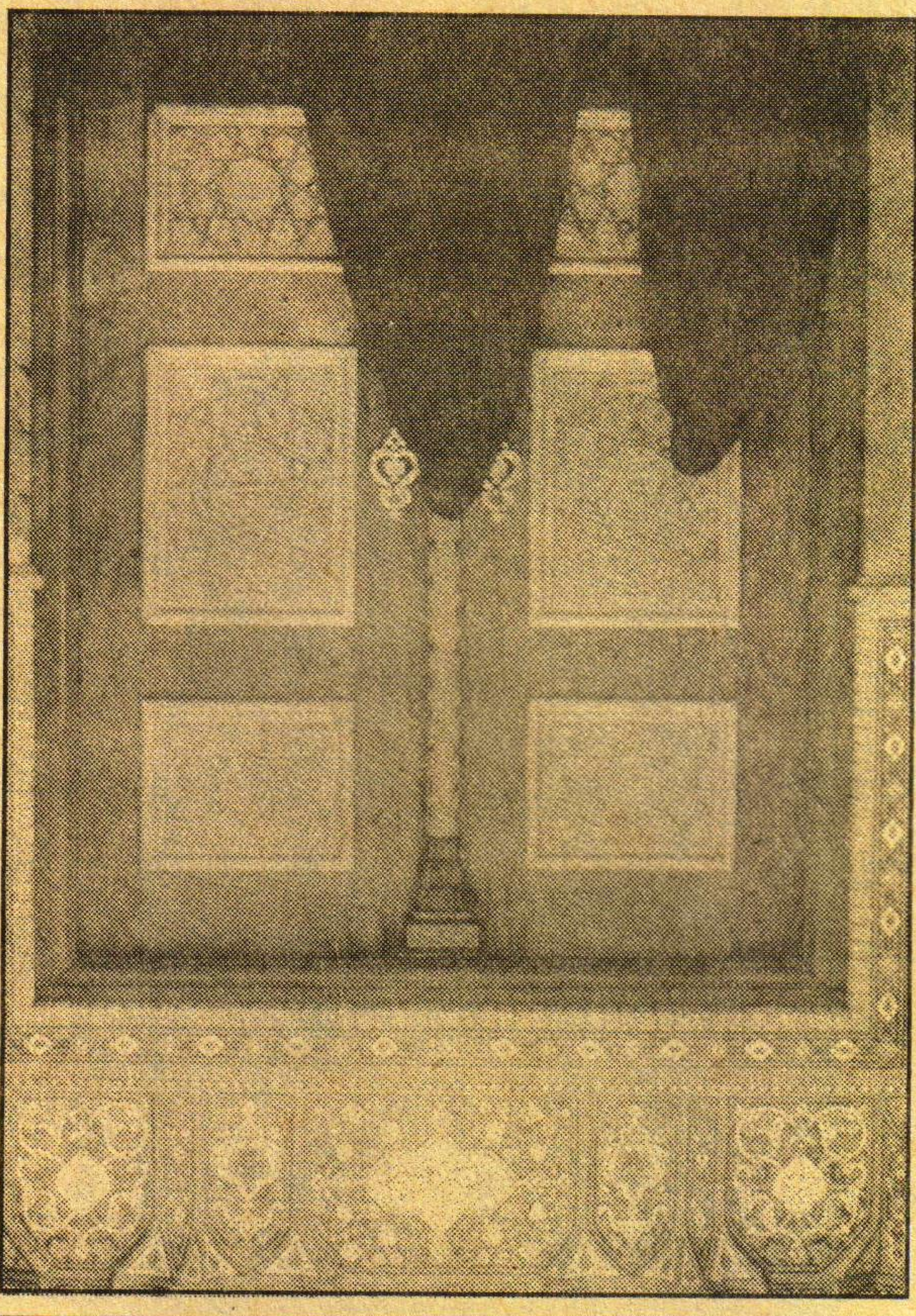
(۳) مومن عورتوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے زینت کی نمائش کریں الا یہ کہ جو خود ظاہر ہو رہی ہوں اور جن کا چھپایا جانا ممکن نہ ہو۔

(۴) مومن عورتیں اپنے سینوں کو ڈھکنے کا خاص التزام کریں۔

(۵) مسلم خواتین کے لئے زینت کو چھپانے کا التزام ضروری ہے مگر بعض قریبی رشتے داروں کے لئے خصوصی رعایت رکھی گئی ہے۔

(۶) مسلم خواتین کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ زمین پر اپنے پاؤں اس طرح مارتی چلیں کہ ان کی زینت کی طرف لوگوں کی توجہ ملتفت ہو۔

ان بنیادی اصولوں کی پابندی ہر مسلم خواتین کے لئے لازم ہے۔ اس میں نہ تو کوئی کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی۔ اب ان احکامات کو بجالاتے ہوئے اسے اس بات کی آزادی ہے کہ وہ مسلم معاشرے کی تعمیل میں اپنی توفیق کے مطابق حصہ لے



مسلم خواتین پر مسجدوں کے دروازے بند کیوں؟
رسول اللہؐ کا ارشاد ہے "اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ روکو"

احادیث میں جلباب کا جہاں بھی تذکرہ آیا ہے اس سے ایک ایسی چادر مراد لی گئی ہے جو عام طور پر عورتیں گھر سے باہر نکلتے وقت استعمال کیا کرتی تھیں۔ شیخان نے ام عطیہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ نے ہم عورتوں کو عیدین کی نماز میں شرکت کا حکم دیا تو اس وقت ہم نے پوچھا یا رسول اللہ ہم میں سے ایک کے پاس جلباب نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کیا وہ اپنی بہن کا جلباب نہیں لے سکتی؟ خمار اس چھوٹی چادر کو کہتے ہیں جو عام طور پر سر اور سینے کے ڈھکنے کے لئے اندرون خانہ استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے "لا یقبل اللہ صلاۃ الحائض الا بخمار" جلباب اور خمار سے سر اور سینہ تو ڈھکا جاتا ہے چہرہ

نہیں اور نہ ہی ان آیات میں چہرہ ڈھکنے کا کوئی حکم دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس آیت سے چہرہ ڈھکنے کا حکم برآمد کرتے ہیں وہ اپنی سہولت کے لئے "یدنین علیھن من جلابیبھن" کا ترجمہ کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ "وہ اپنے اوپر چادر کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں" جو شخص عربی زبان کا معمولی سا ذوق بھی رکھتا ہے وہ باسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہ خواہ مخواہ کی کھینچ کھانچ ہے، یہ ترجمہ زبان کی صحت پر پورا نہیں اترتا۔ عربی زبان میں ادنی کے معنی قریب کرنے کے ہیں چنانچہ راغب اصبہانی نے مفردات میں لکھا ہے "دانیت بین الامرین، ادنیت احدھما من الاخر" اسی طرح ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بتایا کہ دراصل شارع کا مقصد ہے "تدنی الجلباب الی وجھھا، ولا تقرب بہ" کہ وہ جلباب اپنے چہرے کے قریب کر لے لیکن اس کے اوپر نہ ڈالے یعنی چہرہ ڈھکے نہیں۔

جہاں تک چہرے کے پردے کا سوال ہے تو یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لئے خاص ہے۔ شیخان نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ "جب خیبر کی جنگ میں صفیہ بنت حی آئیں تو صحابہ کرام نے آپس میں کہا، پتہ نہیں آپ نے ان سے شادی کر لی ہے یا انہیں خادمہ کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں؟ تو ان لوگوں نے کہا اگر انہیں پردے میں ڈال دیں تو سمجھو آپ نے شادی کر لی ہے اور اگر پردہ نہ کرائیں تو سمجھو کہ یہ خادمہ ہیں۔" چہرے کے بارے میں جمہور علماء کی رائے ہے کہ اسے ستر عورت میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی اسی خیال کے حامی ہیں۔ صحیح احادیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام میں چہرہ ڈھکنے اور دستانے پہننے سے منع فرمایا ہے۔

"ذالك ادنی ان یعرض فلا یوذین" کی جس تفسیر پر چہرے کے پردے کی عمارت کھڑی کی گئی، ذرا اس کا بھی حال ملاحظہ کیجئے۔ طبری، حصاص، رازی وغیرہ نے اس آیت کی تشریح میں جو واقعہ نقل کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے "جاہلیت میں منافقین مومن عورتوں کو پریشان کیا کرتے تھے اس لئے عام لونڈیوں کو آزاد عورتوں سے ممتاز کرنے کے لئے اللہ نے جلباب کے استعمال کا حکم دیا"۔ رازی نے اس خیال کو مزید مدلل کرتے ہوئے کہا کہ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اولا اس لباس سے یہ پتہ چل جائے گا کہ وہ اشراف کی عورتیں اور ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ ثانیا عام لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ بدکار عورتیں نہیں ہیں کیوں کہ جو عورت چہرہ چھپائے گی، جو کہ ستر میں شامل نہیں ہے جس کا چھپانا لازم ہو تو کوئی

اس قبیل کے علماء کی تمام دلیلوں کو پڑھ جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ اپنے نقطہ نظر کے ثبوت میں کتاب وسنت سے کوئی دلیل لانے کے بجائے اصول احتیاط کا سہارا لیتے ہیں اور وہ ایسا کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کو احتیاط اور مصالح کا کہیں زیادہ علم ہے۔

شخص اس سے یہ توقع نہیں کرے گا کہ ایسی کوئی عورت بدکاری پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ یہ واقعہ ابن ابی سبرہ کے حوالے سے ابن کعب القرظی نے نقل کیا ہے۔ اس واقعے میں بعض ایسی تاریخی غلطیاں موجود ہیں جو اس کے ضعف پر دلالت کرتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت ابن کعب القرظی سے آگے نہیں جاتی اور القرظی خود تابعی ہیں۔ گویا یہ حدیث مرسل ہے۔ پھر یہ کہ ابن ابی سبرہ حدیث وضع کرنے میں شہرت رکھتے ہیں۔



اس آیت کی تشریح میں چہرہ چھپا کر شریف زادیاں ثابت کرنے والے جتنے واقعات بھی نقل کئے جاتے ہیں وہ سب کے سب مرسل ہیں۔ ان کا اصل صورت حال سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ واقعہ اسلام کی اس ثقافت سے بھی ٹکراتا ہے جس میں ایمانی سطح پر غلام اور آقا، آزاد عورتیں اور باندیاں ایک ہی سطح پر رکھی گئی ہیں۔ ورنہ یہ کون سا اسلامی معاشرہ ہوا جہاں شریف زادیوں کو تو چہرہ چھپا کر بدکار مردوں کی زد سے بچانے کا انتظام کر لیا گیا اور لونڈیوں کو بدکاروں کے مشق ستم بننے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اس قبیل کے مفسرین جو اپنے دلائل کے محل اس قسم کی ضعیف روایتوں پر تعمیر کرتے ہیں وہ غیر آزاد مسلم عورت کے بارے میں عجیب و غریب تصورات رکھتے ہیں۔ یہ بوالعجبی آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

ابو بکر حصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں۔ "کسی غیر محرم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ لونڈی کے بال دیکھے، بازو دیکھے، ٹانگیں دیکھے، سینہ دیکھے اور پستان دیکھے"۔ کوئی ان سے یہ پوچھے کہ اس کے بعد بچا ہی کیا۔

اسلام آزاد اور غیر آزاد مومن عورتوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں تو غلام، آقا، مرد اور عورت سب برابر ہیں۔ عظمت کا معیار تقوی ہے۔ زنا آزاد عورتوں سے کیا جائے یا غلام عورتوں سے یہ بہرحال زنا ہے۔ ایک پاکیزہ معاشرہ اس سلسلے میں نرم رویہ نہیں اختیار کر سکتا۔ پھر اگر کسی کے نزدیک جلباب کا استعمال یا چہرے کا پردہ اس لئے ضروری ہے کہ شریف زادیوں کی علامتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ قرآن کی آیات کو اصل متن سے دور لے جا کر عجیب و غریب تاویلات میں پھنسانا مناسب نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان آیات سے وہی مطلب نکالیں جو سیدھے طور سے

متن سے برآمد ہوتا ہو اور جس کی تصدیق آپ کے عہد میں صحابیات کے عمل سے ہوتی ہو۔ ان آیات میں احکام حجاب کا خلاصہ یہ ہے کہ مومن عورتوں پر لازم ہے کہ وہ گھر سے باہر نکلتے وقت اپنے آپ کو جلباب سے ڈھک لیں، البتہ انہیں چہرہ اور دونوں ہاتھ کھلے رکھنے کی اجازت ہے تاکہ وہ سہولت سے اپنے سارے کام کاج اسی طرح انجام دے سکیں جیسے عہد نبوی میں انجام دیتی تھیں۔

رہے وہ لوگ جو چہرے کے پردے پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں اور جو کسی بھی صورت چہرے اور ہتھیلیوں کے کھولنے کی اجازت نہیں دیتے تو وہ دراصل احکام سے ناواقف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حضرات پردے کے سلسلے میں قرآنی حدود پر اپنے ذاتی رجحانات کو فوقیت دیتے ہیں۔ اس قبیل کے علماء کی تمام دلیلوں کو پڑھ جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ اپنے نقطہ نظر کے ثبوت میں کتاب وسنت سے کوئی دلیل لانے کے بجائے اصول احتیاط کا سہارا لیتے ہیں اور وہ ایسا کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کو احتیاط اور مصالح کا کہیں زیادہ علم ہے۔ پھر اگر اس نے مسلم خواتین کو چہرے اور ہتھیلی کھولنے کی اجازت دے رکھی ہے تو آپ بھلا کون ہوتے ہیں جو رفع فتنے کے بہانے حدود اللہ پر اضافہ فرمادیں۔

اس بارے میں تو تقریبا تمام مسالک کا اتفاق ہے کہ چہرہ ستر میں داخل نہیں ہے۔ حنفی مسلک میں عورت کے لئے اپنا چہرہ اور ہاتھ کھولنا جائز ہے۔ مالکیوں میں اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ چہرے اور ہاتھوں کو چھپانا واجب قرار دیتا ہے تو دوسرا گروہ اس کے کھولنے کو جائز سمجھتا ہے۔ شافعیوں کے اکثر علماء چہرہ کا چھپانا واجب نہیں سمجھتے البتہ اسے بہتر خیال کرتے ہیں۔ حنبلیوں کے نزدیک بناؤ سنگار اور سادہ چہرے میں فرق کیا جائے گا اور یہی فرق غیر معمولی طور پر حسین وجمیل عورت اور عام شکل وصورت کی عورت میں کیا جائے گا۔ فقہاء چہرے کے پردے کے قائل ہوں یا نہیں البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ عورت کا چہرہ ستر میں داخل نہیں۔ اب جو لوگ اس وضاحت کے باوجود چہرے کو چھپانے پر زور دیتے ہیں تو ان کی دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک دراصل اکتشاف وجۃ سے ہی فتنے کے دروازے کھلتے ہیں۔ بعض لوگ چہرے کو جنسی کشش کا مرکز و محور گردانتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر سارے جسم کو چھپا کر چہرے کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کسی قلعے کے چھوٹے چھوٹے دروازے تو دشمن کے ڈر سے بند کر دیے گئے ہوں البتہ صدر دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا ہو۔ سید ابوالاعلی مودودی نے چہرے کے پردے کی حمایت میں جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ اب انہیں کون بتائے کہ جس دروازے کو اللہ اور اس کا رسول بند کرنا نہیں چاہتا اسے بند کرنے کا ہم میں سے کسی کو حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلام تو نام ہی اس رویے کا ہے کہ "اللہ اور اس کا رسول جو کچھ تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے روکے اسے سے رک جاؤ" ہمیں اس بات کا قطعی اختیار نہیں کہ رفع فتنہ کی خاطر کسی احکام پر اضافہ کریں۔ اگر خواتین کا چہرہ بیمار مردوں کے جذبات پر ارتعاش پیدا کرتا ہے اور اس سے اگر مریضانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کو اپنا ایمان سنبھالنے میں دشواری محسوس ہوتی ہو تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قبیل کے مردوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کی جائے نہ کہ ان کی کمزوریوں کو جواز بنا کر مسلم خواتین پر وہ پابندیاں عائد کر دی جائیں جو شرع نے ان پر عائد نہیں کی ہے اور جس کا صدر اول کی اسلامی سوسائٹی میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔



اسلام کسی ایسی معاشرت کا قائل نہیں جس میں عورتوں کی انفرادی شناخت ختم کر دی گئی ہو۔ Faceless (بے چہرہ) مسلم خواتین کا کوئی تصور ہماری معاشرت سے میل نہیں کھاتا۔ قرن اول کی مسلم سوسائٹی میں مسلم خواتین زندگی کے مختلف شعبوں میں ممتاز مناصب پر فائز نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے چہرے بشرے سے پہچانی جاتی ہیں، چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں اور احادیث میں جن ممتاز خواتین کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان کی شناخت بھی چہرے کی ساخت اور جسم کی رنگت سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ حضرت عمر کو جس عورت نے مہر کے مسئلہ پر عین خطبے کے دوران ٹوکا تھا

بقیہ: صفحہ ۳۴ پر

اگر خواتین کا چہرہ بیمار مردوں کے جذبات پر ارتعاش پیدا کرتا ہے اور اس سے اگر مریضانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کو اپنا ایمان سنبھالنے میں دشواری محسوس ہوتی ہو تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قبیل کے مردوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کی جائے نہ کہ ان کی کمزوریوں کو جواز بنا کر مسلم خواتین پر وہ پابندیاں عائد کر دی جائیں

کیا حصول علم کے لئے پردہ ترک کرنا جائز ہے؟

اہل شریعت کے مابین اختلاف رائے پر عرب پریس سے ایک رپورٹ

ترکی میں تحریک اسلامی کے ایک قائد نے حجاب اور طالبات کی تعلیم کے بارے میں ایک ایسا صحافتی بیان دیا جس سے علمی حلقوں میں ایک بحث چھڑ گئی۔ بیان کے الفاظ یوں تھے "یہ لازم ہے کہ حجاب کا التزام یونیورسٹی کی تعلیم کا بدل نہ قرار پائے کیوں کہ ہمارا دین حنیف حصول علم پر زور دیتا ہے" اور "اس قضیہ کا حل کچھ ایسی شکل میں ہو جو طالبات کو تعلیم سے محروم نہ کرے"

بعینہ یہی خیال ڈاکٹر نصر فرید واصل، مفتی مصر کا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ تعلیم میں اگر حجاب مانع ہو تو ترجیح کس کو دی جائے گی تو ان کا جواب تھا "اسلامی شریعت میں حجاب فرض عین ہے جو قرآن کریم سے اور احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن میں سورۃ النور کی آیت نمبر ۳۱ میں صریح حکم ہے "اور اے نبی مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچاکر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں، وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے۔ شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے لونڈی و غلام، وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا علم لوگوں کو ہو جائے اے مومنو تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔"

اسی طرح حضرت اسماء بنت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث "جب عورت بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے لئے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ کسی بھی عضو کی بے پردگی جائز نہیں" فرضیت حجاب کی دلیل کے لئے کافی ہے۔

لیکن اسلامی شریعت میں حصول علم بھی فرض ہے۔ چنانچہ حدیث "طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة" (علم کا حصول ہر مسلم مرد و عورت پر فرض ہے) ہر مسلمان پر ایک ضروری حد تک حصول علم کو فرض قرار دیتی ہے جس کے بغیر ایک مومن کی دینی اور دنیاوی زندگی کی بقا ممکن ہو۔ اس ضروری مقدار سے مزید علم کا حصول فرض کفایہ ہے۔ اگر ان دو فرضوں (فرض



حجاب اور فرض تعلیم) میں تعارض ہو جائے تو مسئلہ یکسر ترجیحات کی پرکھ اور رخصت و عزیمت سے متعلق ہوگا۔ اگر کسی غیر مسلم ملک یا اسلامی نظام سے محروم مسلم ملک میں کوئی طالبہ اس صورت حال سے دوچار ہو تو اسے موجودہ صورت حال اور اپنی ضروریات کا صحیح اندازہ کر کے اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہئے کہ وہ علم جس کے حصول کے لئے اسے حجاب ترک کرنا پڑے گا کیا اس کے لئے اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر جینا مشکل ہے۔ اگر دل کا جواب اثبات میں ہے یعنی حصول علم ازحد ضروری ہے تو اس طالبہ کا معاملہ اس مجبور کی طرح ہوگا جس کے لئے (وقتی طور پر) شرعاً ممنوع اور حرام چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ علم کی نوعیت کیا ہے، دینی یا دنیاوی، جو چیز ملحوظ رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت نے اضطراری کیفیت میں جو اجازت دی ہے اور جو حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بے پردگی کا جبری مطالبہ اگر سر کے بالوں کا ایک حصہ کھول کر پورا کیا جا سکتا ہو تو پورا سر کھولنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر یہ مطالبہ صرف سر کے بال کھلنے سے پورا ہو جائے تو گردن اور بازوؤں کی نمائش یا کسی بھی طرح کی بے پردگی، خود نمائی اور اظہار زینت ممنوع ہے اور بے معنی بھی۔ یہ اجازت صرف اس وقت تک ہے جب تک طالبہ کو اسلامی مدارس اور مراکز میسر نہ آئیں، گھر

کی تعلیم اس کے لئے ناکافی ہو یا مادی وسائل کی قلت حصول علم کی غرض سے اسے کسی مسلم ملک یا کسی ایسے غیر مسلم ملک کے سفر سے باز رکھتی ہو جہاں اسلامی شریعت پر پابندی نہ ہو۔ اگر یہ موانع اور مشکلات نہ ہوں تو حجاب کے سلسلہ میں کسی مسلم طالبہ کے لئے کوئی رخصت نہیں ہوگی۔ حکم الٰہی کا کامل اتباع اس کے لئے ضروری ہوگا بصورت دیگر وہ اسلامی فرائض کی سرتابی کرنے والی، ہوائے نفسانی کی پرستار مانی جائے گی۔

ازہر کی فتوی کمیٹی کے ممبر شیخ جمال قطب بھی ڈاکٹر نصر فرید کے مذکورہ بالا خیال سے اتفاق کرتے ہیں۔ شیخ کہتے ہیں "مسلمان دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکتے ہیں نہ دنیا کی زمام کار سنبھال سکتے ہیں جب تک کہ گردو پیش کے حالات وواقعات پر ان کی گہری نظر نہ ہو۔ چنانچہ تعلیم اور حجاب کے سلسلہ میں میرا خیال ہے کہ مسلم طالبہ اگر مجبور ہو تو حجاب ترک کردے اور تعلیم حاصل کرے۔ کیونکہ تعلیمی مدت چند سالوں تک محدود ہوتی ہے اور وہ بھی ہر روز چند گھنٹوں کا معاملہ ہوتا ہے، اس کے بعد تو پھر اسے حجاب ہی میں رہنا ہے۔

ڈاکٹر صبری عبدالرؤف جو جامعہ ازہر میں فقہ مقارن کے استاذ ہیں، مذکورہ بالا رائے سے کلی اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالی نے عورت کو چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ پورے بدن کو مستور رکھنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے "ولایبدین زینتھن الا ما ظھر منھا" (اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے) یہ ایک متفق علیہ فریضہ ہے اس لئے عورت کے لئے کسی بھی طور جائز نہیں کہ قرآن کی متعین کردہ حدود سے تجاوز کرے اور غیروں کے سامنے بے پردہ رہے۔

یہ بجا ہے کہ ہر مسلم مرد و عورت پر علم کا حصول فرض ہے لیکن تعلیم اور حجاب میں تعارض کی صورت میں عورت کو تعلیم چھوڑنی ہوگی، حجاب نہیں۔ چنانچہ دو نقصانات میں سے نسبتاً ہلکا نقصان ہی چنا جاتا ہے یہ فطری بھی ہے اور واجب بھی۔ فقہ کا ایک اصول ہے کہ ایک ضرر کے ازالہ کے لئے دوسرے ضرر کا استعمال صحیح نہیں۔ اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو عورت کی بے پردگی ایک فتنہ ہے، ایک خرابی ہے اور حصول علم ایک بھلائی ہے، ایک خوبی ہے۔ ایک خوبی کے لئے ایک فتنہ کو دعوت نہیں دی جاسکتی کیونکہ ہر حال میں فتنوں اور برائیوں کا ازالہ خوبیوں کے حصول پر مقدم ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ عورت حجاب کے معاملہ میں غفلت نہ برتے۔

مسلمانوں کا اپنے شرعی احکام سے اتنا مضبوط رشتہ ہونا چاہئے جسے مفسدین کا نظام جبر و اکراہ اور باطل کے بہکاوے توڑ نہ سکیں، ورنہ بنائے دین کی ایک ایک اینٹ گرتی جائے گی اور مسلمانوں کا رشتہ اسلام سے صرف نام کا رہ جائے گا

اسلام میں کوئی عذر یا کوئی رخصت کسی دوشیزہ کو حجاب چھوڑ دینے کا حق نہیں دیتی حتی کہ کوئی غیر مسلم ملک بھی اگر حجاب پر پابندی عائد کردے تو اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اس صورت میں بھی بے حجابی جائز نہیں۔

صرف اس بنا پر کہ کسی عالم نے اس کے حق میں فتوی دے دیا اور اس کے لئے حصول علم کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ حجاب چھوڑ نہ بیٹھے۔ حدیث رسول ہے۔ "لا یکن احدکم امعة یقول انا مع الناس، ان احسن الناس احسنت وان اساؤا اسات ولکن وطنو انفسکم ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساؤا ان تتجنبوا اساتھم" تم میں سے کسی کو ابن الوقت نہیں ہونا چاہئے کہ وہ ہر نیک و بد اور خیر و شر میں لوگوں کے ساتھ رہے۔ انہی کے رنگ ڈھنگ پر جئے، لوگ اچھائی کریں تو وہ بھی اچھائی کرے اور لوگ برائی کریں تو وہ بھی برائی کرے بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ تم اپنے دلوں میں یہ بات راسخ کرو کہ لوگوں کی اچھائیوں میں تو شریک رہو گے ہی لیکن ان کی برائیوں سے دور رہو، پرہیز کرو۔

قصیم کی جامع مسجد کے امام و خطیب شیخ عبداللہ بن ابراہیم القرعاوی کہتے ہیں "یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم واجب نہیں بلکہ اس کا تعلق دنیاوی مصالح اور مستحب امور سے ہے اس لئے ایک مستحب کی خاطر کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہیں کیا جاسکتا جو شرعاً ممنوع ہو۔ شریعت کی نظر میں جو تعلیم صحیح ہے اس کی خاطر عورت کا پردہ سے دستبردار ہو جانا تو بالکل غلط ہے اس لئے کہ شریعت خود پردہ کا حکم دیتی ہے، ایسی طالبہ جو شرعی تعلیم حاصل کر رہی ہو اس کے لئے شرعی نہج پر چلنا اور اپنی تعلیم کو اپنی عملی زندگی میں لانا ازحد ضروری ہے۔ اس کے برعکس اگر ترک حجاب پر مجبور کرنے والی تعلیم غیر شرعی ہو تو اس تعلیم کی خاطر کسی بھی صورت میں طالبہ کو ترک حجاب کی اجازت نہیں ہے کیونکہ یہ تعلیم غیر واجب ہے۔ ایک غیر واجب تعلیم کے لئے فرض حجاب کو چھوڑ دینا جائز نہیں ہے۔ ترک حجاب قرآن و حدیث کے صریح احکام کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن کہتا ہے "ولاتبرجن تبرج الجاھلیة الاولی" (اور سابق دور جاہلیت کی طرح سج دھج نہ دکھاتی پھرو) آج کی بے پردگی جاہلیت کی بے پردگی سے بہت بڑھی ہوئی ہے اور ایسا بھی نہیں کہ ایک کام زمین کے ایک خطہ میں جائز ہو اور دوسرے میں ناجائز۔ دین ایک ہے، ملت ایک ہے اس لئے شریعت کے احکام بلا استثناء تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر لاگو ہوں گے۔

یہ مشکل بھی انہیں مشکلات کی سی ہے جن سے مغربی ممالک کے مسلمان دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے جب ان معاملات میں ایسے لوگ فتوے صادر کر دیتے ہیں جو شریعت کا بہت کم علم رکھتے ہیں یا اس کے احکام کو اپنی خواہشات کا

مجموعہ سمجھتے ہیں۔ایسے موقع پر سلف صالحین کے منہج پر چلنے والے باعمل علماء کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ان کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل کی خامیوں کی نشاندہی کریں، ان کا ازالہ کریں خاص کر جب کوئی معاملہ عقیدہ سے متعلق ہو۔

اردن یونیورسٹی میں شریعت کے استاذ ڈاکٹر فتحی الدرینی نے اس معاملہ میں سب سے مختلف راہ اپنائی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ مسلم ملکوں میں عورت کی بے پردگی قطعاجائز نہیں اس لئے کہ شرعا بے پردگی حرام ہے۔لیکن غیر مسلم ملکوں میں کام کی نوعیت اور تعلیمی اداروں کے ذمہ دار اگر مسلم طالبہ کو بے پردگی پر مجبور کریں تو اس کے لئے وہاں بے پردہ رہنا جائز ہے کیونکہ تحریم کے کئی مدارج ہیں اور علم عورت کی ایک ضرورت ہے جب تک کہ اس کی جہالت دور نہ ہوجائے۔

شیخ فتح اللہ غولان کے صحافتی بیان کو صحیح قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر فتحی الدرینی نے یہ تبصرہ کیا کہ شیخ کا مقصد دینی نہیں ہے،شیخ احکام شریعت کو حکام سے قربت کا ذریعہ سمجھتے ہیں جو اسلام میں جائز نہیں ہے۔ڈاکٹر الدرینی نے اس پر بھی تنقید کی کہ شیخ غولان نے مسلم اور غیر مسلم ممالک میں تفریق نہیں کی اور اپنی بات میں ایسی مثال دی جو صرف غیر مسلم ممالک پر منطبق ہوتی ہے۔اگر وہ مسلم اور غیر مسلم ممالک میں فرق کرتے تو اچھا ہوتا۔

اردن یونیورسٹی میں شریعت کے ایک دوسرے استاذ ڈاکٹر ہمام سعید کو شیخ فتح اللہ غولان کے قول سے اختلاف ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم کے بجائے حجاب کا التزام واجب ہے۔اس کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں کہ تعلیم کا جو جزء فرض ہے وہ وہی جزء ہے جو دین کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے اس کے علاوہ تعلیم کا دوسرا جزء فرض کفایہ ہے۔اس جزء کو کچھ لوگ حاصل کرلیں تو دوسروں کے سر سے اس کے حصول کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے۔مثال کے طور پر کسی مسلم یا غیر مسلم ملک میں کوئی طالبہ علم الاجتماع (Social Studies) پڑھنا چاہے اور وہاں ترک حجاب کی شرط ہو تو اس کے لئے ترک حجاب جائز نہیں ہوگا۔اسلام میں کوئی عذر یا کوئی رخصت کسی دوشیزہ کو حجاب چھوڑ دینے کا حق نہیں دیتی حتی کہ کوئی غیر مسلم ملک بھی اگر حجاب پر پابندی عائد کردے تو اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔اس صورت میں بھی بے حجابی جائز نہیں۔

ریاض میں شریعت کالج کے استاذ ڈاکٹر عبد الرحمن الزیندی نے لفظوں کے اطلاق کی تعیین اور اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ نص حدیث کی موجودگی میں فرضیت علم سے کسی کو اختلاف نہیں۔لیکن وہ علم جس کا حصول واجب ہے،شرعی علم ہے۔احکام شریعت اور اعتقادی مسائل کا علم،جس کے بغیر دین بے معنی ہے۔اس علم کا حصول درس نظامی کے ذریعہ ممکن ہے۔گھریلو تعلیم،خاص مدارس اور مخصوص اساتذہ سے بھی بقدر ضرورت اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

شریعت کی نظر میں جو تعلیم صحیح ہے اس کی خاطر عورت کا پردہ سے دستبردار ہوجانا تو بالکل غلط ہے اس لئے کہ شریعت خود پردہ کا حکم دیتی ہے۔ایسی طالبہ جو شرعی تعلیم حاصل کررہی ہو اس کے لئے شرعی نہج پر چلنا اور اپنی تعلیم کو اپنی عملی زندگی میں لانا ازحد ضروری ہے

ڈاکٹر الزیندی نے بتایا کہ حجاب عورت کا شرعی ساتر لباس بھی ہے اور اس کا مردوں کے اختلاط سے پرہیز ایک مناسب طریقہ اظہار بھی۔ایک مسلم عورت سے شریعت کو یہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں۔

ڈاکٹر الزیندی کہتے ہیں کہ حجاب اور علم شرعی کے حصول میں اولا تو کوئی تعارض نہیں لیکن خدانخواستہ کسی وجہ سے ایسا ہو بھی جائے کہ حصول علم دین کے لئے ایک دینی فرض کو ترک کرنا پڑے تو ایسی صورت میں طالبہ کو چاہئے کہ وہ ایسا ادارہ ہی چھوڑ دے جو اس سے اتنی بڑی قربانی مانگ رہا ہو اور اپنے گھر میں دوسرے ممکن ذرائع سے علم حاصل کرے۔

تکنیکی،فنی اور اجتماعی علوم (Social Sciences) کا حصول ملت کے ہر فرد پر فرض نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر پوری ملت پر فرض ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ علوم فرض عین کے زمرہ میں نہیں بلکہ فرض کفایہ کے زمرہ میں داخل ہیں۔ان علوم کی قیمت اگر طالبہ کو حجاب یا کسی دوسرے دینی حکم سے دستبرداری کی صورت میں چکانی پڑے تو ایسی صورت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالبہ کو اپنی عزت و عصمت اور اپنے اسلام کو بچالینا چاہئے خواہ اس کا نتیجہ ڈگریوں سے محرومی ہی کیوں نہ ہو۔

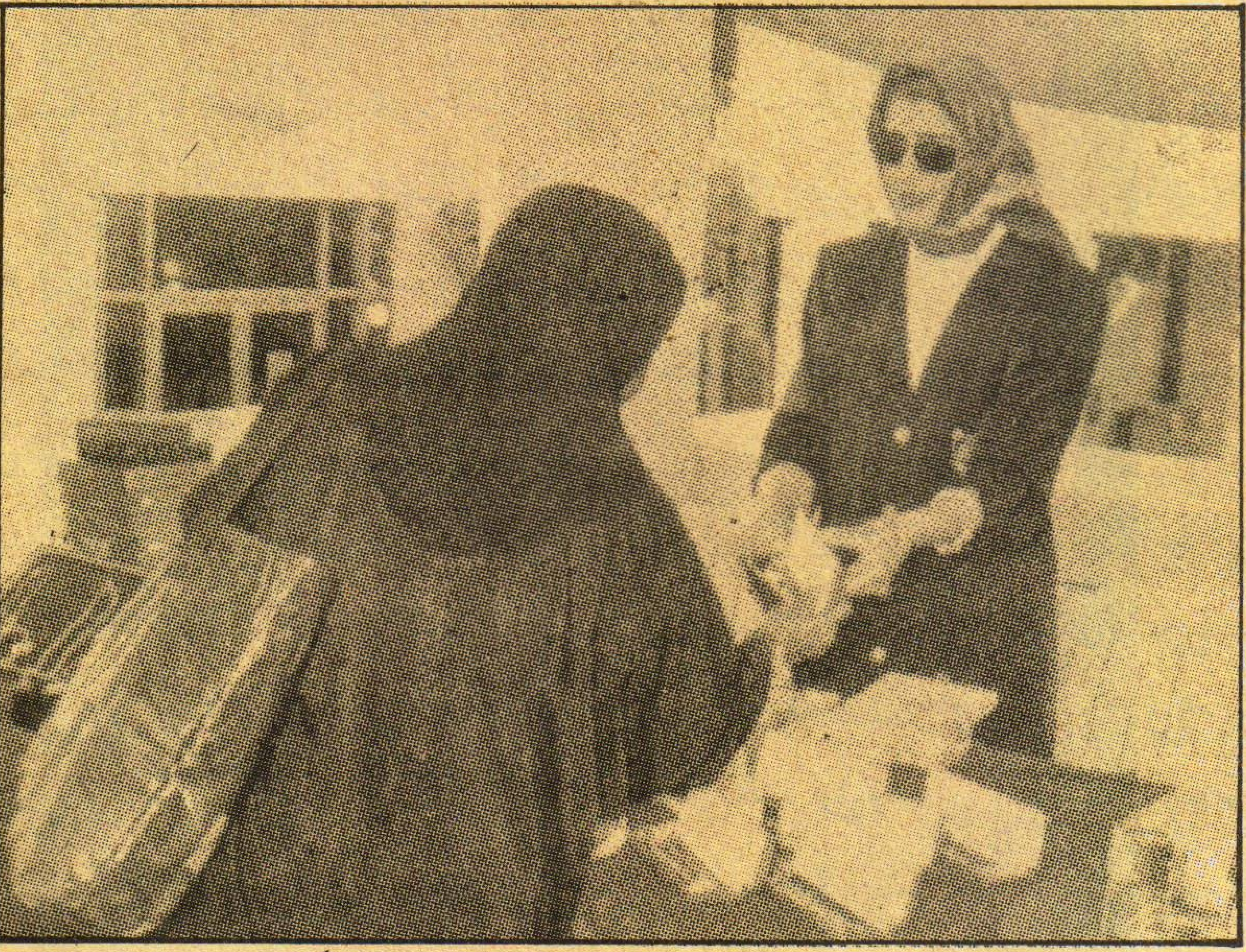
ڈاکٹر الزیندی نے کہا کہ شریعت اسلامیہ میں عرف معتبر ہے۔حالات اور زمانہ کی تبدیلی کے نتیجہ میں مسائل اور فتاوی بدلتے رہتے ہیں۔احکام شریعت جو کتاب و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہیں اب تک حق کی نمائندگی کررہے ہیں اس لئے ان کی پاسداری ہر مسلمان پر واجب ہے۔کسی معاشرہ میں اچھائیاں دب جائیں،نظام حیات فساد کا شکار ہوجائے تب بھی ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے عقیدہ اور شریعت کی مضبوط ڈگر سے ایک انچ بھی ہٹ جائے،چنانچہ کثرت زنا، شراب نوشی اور جنسی بے راہ روی کا بازار گرم سہی،ایک مسلمان کا ان معاملات میں تساہل برتنا ان سے اثر قبول کرنا،حرام کو حلال کرلینا اور فرض کو ساقط کردینا کسی بھی طور جائز نہیں۔

مسلمانوں کا اپنے شرعی احکام سے اتنا مضبوط رشتہ ہونا چاہئے جسے مفسدین کا نظام جبر واکراہ اور باطل کے بہکاوے توڑ نہ سکیں۔ورنہ بنائے دین کی ایک ایک اینٹ گرتی جائے گی اور مسلمانوں کا رشتہ اسلام سے صرف نام کا رہ جائے گا اور صورت حال ان مسلم معاشروں کی سی ہوجائے گی جہاں گمرہی اور فساد کی بھول بھلیوں میں اسلام کی شاہراہ کھوگئی ہے۔

کیا عورتیں منصب قضا کی متحمل ہو سکتی ہیں؟

امریکہ یوروپ اور بعض ایشیائی ممالک میں زندگی کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ عدلیہ میں بھی عورتیں فعال کردار ادا کر رہی ہیں اور اعلی منصبوں پر فائض ہیں لیکن بیشتر اسلامی ممالک میں اس موضوع پر بحث و تمحیص جاری ہے کہ کیا عورتیں جج اور چیف جسٹس کے فرائض کو پوری ذمہ داری سے نبھا سکتی ہیں؟ مصری عدلیہ کی مجلس اعلی کے صدر نے اس پیشے کو اختیار کرنے سے انھیں خبردار کیا ہے کیونکہ اس کے بعض پہلو عورت کی حیا کے منافی ہیں اور اس کی خانگی زندگی کو انتشار کے راہ پر ڈالنے والے ہیں۔

یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جن کے اردگرد خصوصا مصر کے تعلیم یافتہ حلقوں میں یہ مسئلہ موضوع گفتگو بنا ہوا ہے کہ کیا خواتین کیلیے عدالتی منصبوں کو سنبھالنا ممکن ہے۔ ایک حلقہ ہے جو عورتوں کو اس شعبے سے الگ رکھنے کے لیے شرعی تاویلیں پیش کرتے ہوئے صنفی سطح پر مرد اور عورت کی طبیعت اور مزاج میں فرق کی بنیاد پر انھیں اس قابل نہیں سمجھتا جب کہ عدلیہ سے وابستہ ہونے کی خواہش مند خواتین کے دلائل حقوق انسانی کے چارٹر اور بین الاقوامی قانون کی دفعات پر مبنی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ طرفین میں سے کس کے دلائل زیادہ وزنی ہیں اس بحث سے ایک بات جو واضح طور پر سامنے آئی ہے وہ یہ کہ کسی فرد کو ایسے منصب پر فائز کرنے میں جس کا تعلق عامۃ الناس کے فائدے اور نقصان سے ہو اور جہاں لوگوں کی زندگی اور موت کا سوال ہو وہاں اسلام نے احکامات صادر کرنے میں حد درجہ احتیاط برتی ہے۔ گویا کہ محض کسی کام کو کرلینے کی اہلیت ہی اس منصب پر کسی کو فائز کردینے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس منصب کی رو سے منتخب کیے جانے والے فرد میں اپنے فرض کو پورے خلوص اور دیانت داری سے ادا کرنے کا جذبہ بھی موجود ہو۔ اسی بناء پر اسلام کی نظر میں منصف کا منصب انسانوں کو سونپی جانے والی ذمہ داریوں میں سے حساس ترین ذمہ داری کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو ذمہ داری اور اہلیت کا تصور ہر پیشے سے وابستہ ہے لیکن ایک منصف سے نہ جانے کتنے انسانوں کی زندگیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اس کے ایک لفظ پر عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی زندگی اور موت، حراست و رہائی کا انحصار ہوتا ہے۔



مصر میں سماجی امور کے سابق وزیر یہ دلیل پیش کرتے ہوئے عورتوں کو اس منصب پر لانے کے حامی ہیں کہ اس وقت کہاں مسلم ممالک میں اس پر عمل ہو رہا ہے اور یہ کہ شریعت میں کوئی شق ایسی نہیں ہے جس کی رو سے عورتوں کے منصب قضا سنبھالنے پر پابندی عائد کی جائے۔ ان کے مطابق یہ کہنا درست نہیں کہ عورت جذبات سے مغلوب ہوتی ہے اور اس کا دل کمزور ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عورتوں اور بچوں کے بہت سے مقدمات میں خاتون منصف ان کے مسائل کو مرد کے مقابلے میں بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔ مصری پارلیمنٹ کی شرعی کمیٹی کی سابق ممبر فوزیہ عبدالستار اسی موقف کی حمایت اس مثال کی روشنی میں کرتی ہیں کہ خلیفہ دوم عمر بن خطاب نے مدینہ منورہ میں شفاء بنت عبداللہ کو سرپرستی کے مقدمات فیصل کرنے پر مامور کیا تھا اور جہاں تک سوال ہے اس منصب سے متعلق قانون کا تو اس میں مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے، جس کا مطلب ہے کہ عورت کے جج بننے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

ایک طرف تو دلائل اور تاویلیں جو عدلیہ کے مناصب پر عورتوں کو بٹھانے کے حامی حلقے کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں، دوسری طرف شرعی اور عملی نقطہ نظر ہے۔ مذکورہ موقف پر معترض ہونے والے افراد میں مشیر قانونی

اسلام کی نظر میں منصف کا منصب انسانوں کو سونپی جانے والی ذمہ داریوں میں سے حساس ترین ذمہ داری کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو ذمہ داری اور اہلیت کا تصور ہر پیشے سے وابستہ ہے لیکن ایک منصف سے نہ جانے کتنے انسانوں کی زندگیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اس کے ایک لفظ پر عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی زندگی اور موت، حراست و رہائی کا انحصار ہوتا ہے

عبدالرزاق احمد مصطفی ہیں جو عدالت مرافعہ (کورٹ آف اپیل) کے نائب صدر بھی ہیں۔ وہ منصفی کو ایک باوقار اور سنجیدہ منصب تصور کرتے ہیں جو کڑی محنت چاہتا ہے اور اس کے بعد ہی اس کا صحیح معنوں میں اہل شخص تیار ہوتا ہے اور اسی لیے جج براہ راست نہیں بھرتی ہوجاتا یہاں تک کہ وہ کئی مدارج سے ہوتے ہوئے اس مرحلے پر پہنچتا ہے۔ اور اس سے پہلے کے مراحل پر اسے کئی کئی سال تک کام کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران اسے مختلف نوعیتوں کے مقدمات سے سابقہ پڑتا ہے مثلاً قتل، چوری، زنا، آتشزنی، اتلاف جائیداد، غبن، اغوا، ہتک عزت جن کے لیے حقیقت تک پہنچنے میں بڑی عرق ریزی درکار ہوتی ہے۔ عبدالرزاق احمد مصطفی ایسے آٹھ اسباب گناتے ہیں جن کی رو سے خواتین کا تقرر عہدہ قضا کے لیے موزوں نہیں ہے۔

پہلی وجہ تو سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ ہے اور پھر رسول اللہ کا فرمان بھی ہے کہ "جس قوم کے معاملات کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ میں ہو وہ ہرگز فلاح نہ پائے گی" "منصب قضا بھی چونکہ ولایت کی قسم سے ہے اس لیے عورت جس کی تنہا گواہی خود اللہ کی نظر میں ناقابل قبول ہے اسے اس منصب پر کیسے فائز کی جاسکتا ہے۔ خلفاء راشدین کے عہد میں کسی نے بھی عورت کو یہ عہدہ نہیں سونپا۔ جہاں تک سوال ہے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں سمراء بنت جمیل الاسدیہ اور الشفاء بنت عبداللہ کے عہدوں پر تقرر کا تو ان کا تعلق بے ایمانی اور فریب کاری روکنے کے غرض سے بازار کی نگرانی تھا نہ کہ مقدمات فیصل کرنا۔

دوسرے یہ کہ عہدہ قضا کی ذمہ داریاں عورت کے حالات اور معمولات سے میل نہیں کھاتے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت کثرت سے ہوسکتی ہے اور بیشتر رات کو دیر سے واپسی ہوتی ہے اور آندھی طوفان میں بھی وقت کی یہ پابندی لازم ہوتی ہے۔ پھر ایک فطری حیا اور شرم عورت کے لیے اغوا، زنا وغیرہ کے مقدمات میں تفصیلی تفتیش کی راہ میں مانع ہوگی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ خواتین کے بعض حلقوں کی طرف سے پیش کی گئی یہ تجویز قابل قبول نہیں ہے کہ عورتوں کو دیوانی کے مقدمات سے متعلق عدالتوں میں بھرتی کیا جائے کیونکہ اس تجویز میں عورتوں کے مفاد میں دونوں جنسوں کے درمیان امتیاز کی جھلک ملتی ہے جب کہ مقصد مساوات قائم رکھنا ہے۔ عورت اپنی فطرت کی بنا پر عورت کا ہی ساتھ دے گی۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ عورت اپنی منصبی ذمے داری اور سماجی کردار میں مطابقت نہیں پیدا کرسکے گی جس کے نتیجے میں اس کی خانگی زندگی متاثر ہوگی اور اولاد کی صحیح تربیت نہ ہوپائے گی جو کہ عورت کی اہم تر ذمہ داری ہے۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات کی حدود ہیں۔ ہر وہ کام جو مرد کرتا ہے عورت نہیں کرسکتی اور ایسا دونوں کی طبیعتوں کی ہی بنا پر ہے۔ پتھر توڑنے، کان کنی اور صحرا میں تیل کے دفاتر میں عورتیں اسی وجہ سے کام نہیں کرتیں۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اگر عورت کی فطرت مرد سے مختلف ہے تو یہ اس کے لیے باعث شرم نہیں ہے۔

چھٹا نکتہ یہ ہے کہ کسی نتیجے یا فیصلے تک پہنچنے سے پہلے ایک جج کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم پیشہ افراد سے صلاح و مشورہ کرے اور یہ کام عموماً الگ کمرے میں گھنٹوں بیٹھے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ایسی صورت حال عورت کو درپیش ہو تو اسے ایک دو مردوں کے ساتھ بند کمرے میں کئی کئی گھنٹے بیٹھنا ہوگا، اور یہ غیر شرعی خلوت عوامی سطح پر ناقابل قبول ہوگی اس لیے اس کے دیے گئے فیصلے بھی بے وقعت قرار پائیں گے۔

ساتواں پہلو یہ ہے کہ انتظامی امور میں عورتوں کی صلاحیت اور ان کی کامیابی کو اسٹیٹ کونسل کے امور انجام دینے کی صلاحیت پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔

اسی مفروضے کی روشنی میں آخری بات جناب عبدالرزاق یہ کہتے ہیں کہ وزارت و سفارت کے منصب پر عورت کی کامیابی کو ذاتی کامیابی قرار دیا جاسکتا ہے، اس کی نظیر پر کوئی قاعدہ کلیہ تشکیل نہیں دیا جاسکتا۔

مصری عدلیہ کی مجلس اعلیٰ کے صدر مدحت الراغی بھی جناب عبدالرزاق کے ہمنوا ہیں۔ جن کا کہنا ہے کہ عدلیہ کا منصب مستقل تگ و دو اور ذہنی یکسوئی کا تقاضہ کرتا ہے جو مردوں کے بھی معمولات زندگی میں حارج ہوتا ہے تو عورتوں کو تو اس میں جانے کا تصور ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اسی نہج پر قانونی مشیر محمد مجدی مرجان نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عورتوں کے عہدہ قضا پر ممکن ہونے کا مطالبہ غیر شرعی ہے اور اسے ایک سیاسی حربہ بنانا مغرب کے جال میں پھنسنے کے مترادف ہے جب کہ مغرب میں عورتیں خود گھر واپس آنے کی تمنا رکھتی ہیں۔ مصر کے پڑوس شام میں اگرچہ عدلیہ کے مختلف مناصب پر فائز افراد میں عورتوں کا تناسب ۱۱ فیصد ہے تاہم اس کی مخالفت وہاں بھی اسی قدر ہے۔ وہاں کے ماہرین قانون و عدل کی سوچ بھی مذکورہ افراد سے مختلف نہیں ہے۔

پاکستان میں نفاذ شریعت کا ڈرامہ

غیر شرعی قومی اسمبلی کے ذریعہ شریعت کے نفاذ کی ایک تکلیف دہ صورت حال

پاکستان میں شریعت سے تمسخر کا معاملہ کوئی نئی بات نہیں۔ قیام پاکستان کی ابتداء سے ہی بانیان پاکستان نے اپنے قول و عمل سے اس بات کا اشارہ دے دیا تھا کہ آنے والے دنوں میں مملکت خداداد میں اللہ کی شریعت انسانوں کی شریعت کے تابع رہے گی۔ اور یہ کہ پاکستان میں خدا کی شریعت اسی حد تک قابل قبول ہوگی جب تک وہ انسانی شریعت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ محمد علی جناح جنھیں بد قسمتی سے پاکستان کے قائد اعظم بننے کا شرف حاصل ہے وہ اپنی تقریروں میں کھلے عام یہ کہتے آئے تھے کہ پاکستان میں جمہوری اصولوں کی بنیاد پر ایک معاشرہ قائم کیا جائے گا۔ اور یہ کہ ایک ایسی صورت حال پیدا کی جائے گی جہاں نہ کوئی ہندو ہوگا اور نہ کوئی مسلمان بلکہ صرف پاکستانی قوم باقی رہ جائے گی۔ جناح اور ان کے رفقاء نعرہ تو یقینا اسلامی مملکت کا لگاتے تھے لیکن انھیں نہ تو کسی اسلامی مملکت کا کوئی شعور تھا اور نہ ہی وہ اس بارے میں سنجیدہ تھے۔



تب سے اب تک قیام پاکستان کو نصف صدی بیت چکی ہے لیکن اب تک پاکستان کو اسلامی نظام تو کجا ایسے حکمراں بھی میسر نہ آسکے جن کے دل و دماغ مسلمان ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اسلام اور شریعت کے نام پر مختلف حکمراں گاہے بگاہے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرتے رہے۔

جس ملک کے قائدین کو اس بات کا شعور نہ ہو کہ وہ آئندہ نئی مملکت کو کس راہ پر لے جانا چاہتے ہیں اس ملک کا گمشدہ راہوں پر چل نکلنا کچھ مشکل نہیں۔ پڑوسی ملک پاکستان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی حادثہ پیش آیا ہے۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل محمد علی جناح سے لے کر موجودہ وزیر اعظم نواز شریف کی زندگی پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حضرات اپنی پرجوش خطابت میں اسلام کا جتنا بھی نام لیں ان جیسے رہنماؤں سے کسی اسلامی مملکت کی قیادت کا کام تو ہرگز نہیں لیا جاسکتا۔ جن لوگوں کو سرے سے اس بات کا شعور نہ ہو کہ اسلام زندگی کے مختلف شعبوں کو کس طرح منظم کرتا ہے اور کس طرح فی زمانہ ایک اسلامی مملکت کا کاروبار چلایا جاسکتا ہے، بھلا وہ لوگ کسی ایسی نظری مملکت کی قیادت کے متحمل کیونکر ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کے ساتھ اب تک یہ سانحہ پیش آتا رہا ہے کہ جو لوگ اسلامی ریاست میں چپراسی کے عہدے کے لئے بھی نااہل اور ناکارہ قرار دیئے جاسکتے تھے وہ لوگ مملکت پاکستان کی قیادت پر براجمان ہو گئے۔

موجودہ وزیر اعظم نواز شریف کی شریعت مہم کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ بعض سادہ لوح مسلمان یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ کیا پتہ نواز شریف کے ہاتھوں پاکستان میں شریعت کا نفاذ ہو جائے اور جو کام گذشتہ پچاس برسوں میں التوا کا شکار رہا ہے اسے نواز شریف صاحب چلتے

چلاتے اقتدار سے رخصت ہونے سے پہلے انجام دے ڈالیں۔ ہمارے خیال میں شریعت کسی کے ہاتھوں بھی نافذ ہو ہمیں اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ نواز شریف ہی کیا اگر بے نظیر بھٹو بھی اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہو کر اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے میدان میں آجائیں تو ہمیں غیر مشروط طور پر ان کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ شریعت کسی کا کاپی رائٹ نہیں ہے اور نہ ہی کسی دینی تنظیم یا برانڈ عالم کو اللہ نے نظام مصطفی کے قیام کا ٹھیکہ دے رکھا ہے۔ البتہ ہمیں یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ جو شخص خود کو امیر المؤمنین کے منصب پر فائز کرنا چاہتا ہے وہ اس کی کم از کم شرائط بھی پوری کرتا ہے یا نہیں اور یہ کہ وہ جس اسلامی نظام کا دعویدار ہے اس کے قیام کی بنیادی اہلیت اس کے اندر پائی جاتی ہے یا نہیں؟ پھر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ نظام اسلامی کے قیام میں وہ واقعی سنجیدہ ہے، اس طرف عملی پیش قدمی کا حوصلہ رکھتا ہے یا اسلام کو محض اپنے ذاتی ایجنڈے کی تکمیل کے لئے استعمال کر رہا ہے بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب پاکستان کے سیاسی مسئلہ پر مختلف طالع آزما وقتاً فوقتاً مختلف اسلامی نعروں کے ساتھ طلوع ہوتے رہے ہوں۔ نواز شریف کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ پہلی بار پاکستان میں برسر اقتدار نہیں آئے ہیں اور نہ ہی پہلی بار انھوں نے اسلامی کارڈ کا استعمال کیا ہے۔ اس سے پہلے وہ خود کو ضیاء الحق کا نظری جانشین کہتے رہے ہیں اور جماعت اسلامی کی قربت سے بھی وہ اپنے اسلامی رنگ کو گہرا کرنے کا موقع فراہم کرتے رہے ہیں۔ گویا نواز شریف کوئی ایسے شخص نہیں جن کے یہاں راتوں رات نظری اور فکری تبدیلی آئی ہو اور جو اپنے سابقہ رویے سے ہٹ کر اچانک اسلام کی طرف مائل ہو گئے ہوں۔ اسلام تو کل بھی ان کے اقتدار کا زینہ تھا اور آج بھی اپنے قدموں سے وہ اس سیڑھی کو کھسکنے دینا نہیں چاہتے، جب تک اسلامی زینہ انھیں اوپر تک لے جاتا ہے وہ ان کے لئے قابل قبول ہے۔ البتہ اگر اسی راستے ان کے شخصی اقتدار کو خطرہ لاحق ہو گیا تو وہ ایک لمحے کے لئے بھی اسلام اور اسلامی نظریے کو خیرباد کہنے میں توقف نہیں کریں گے کہ وہ ماضی میں ایسا ہی کر چکے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۹۲ء میں جب نواز شریف وزیر اعظم تھے اس وقت پاکستان کی فیڈرل شریعت کورٹ نے سود کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا تھا، اس فیصلے سے پاکستانی نظام کفر کی بنیاد ہل گئی تھی۔ اس وقت نواز شریف کی حکومت نے شریعت کورٹ کے خلاف ملک کی

جن لوگوں کو سرے سے اس بات کا شعور نہ ہو کہ اسلام زندگی کے مختلف شعبوں کو کس طرح منظم کرتا ہے اور کس طرح فی زمانہ ایک اسلامی مملکت کا کاروبار چلایا جاسکتا ہے، بھلا وہ لوگ کسی ایسی نظری مملکت کی قیادت کے متحمل کیونکر ہو سکتے ہیں۔

اس سے بڑی مضحکہ خیز بات کیا ہوگی کہ مسلمانوں کے ایک ملک میں کتاب و سنت کو دستور حیات بننے کے لئے کوئی نصف صدی سے سیاسی مسلمانوں کے ووٹوں کا انتظار کرنا پڑے۔ کیا انسانوں کے کسی اسمبلی کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ کی شریعت کو دستور اساسی بننے کے سلسلے میں حکم کا کردار ادا کرے؟

سیکولر عدالت میں مقدمہ دائر کیا اور اپیل کی کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کو فوری طور پر کالعدم قرار دیا جائے۔ سیکولر عدالت نے اس فیصلے پر روک لگا دی اور تب سے اب تک سود کا حرام کاروبار اسلامی مملکت کی سرپرستی میں جاری ہے۔ یہ بھی عجب تماشہ ہے کہ جو لوگ شریعت کورٹ کے فیصلوں کو رکوانے کے لئے سیکولر عدالتوں میں اپیل دائر کرتے ہوں وہی لوگ اب ملک میں شریعت کے نفاذ کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ شریعت کے نام پر نواز شریف جو کچھ چاہتے ہیں وہ ایک فراڈ سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۹۱ء میں جب پاکستان میں شریعت بل پر بحث جاری تھی اور جب حکومت لوگوں کو یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں سنجیدہ ہے تو اس وقت بھی دراصل نواز شریف شریعت کے نام پر اپنے شخصی اقتدار کے استحکام کے لئے سرگرم تھے۔ شریعت کے سلسلے میں ان کی منافقت اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ شریعت بل کے دفعہ ۳ میں جہاں یہ بات کہی گئی تھی کہ کتاب اور سنت پاکستان کا سپریم قانون ہو گا وہیں اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی تھی کہ یہ سب کچھ اسی وقت تک قابل قبول ہو گا جب تک کہ موجودہ سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ اس سے متاثر نہ ہو۔ گویا جو بات پہلے جملے میں کہی گئی ہے اس کی نفی دوسرے جملے میں کر دی گئی۔

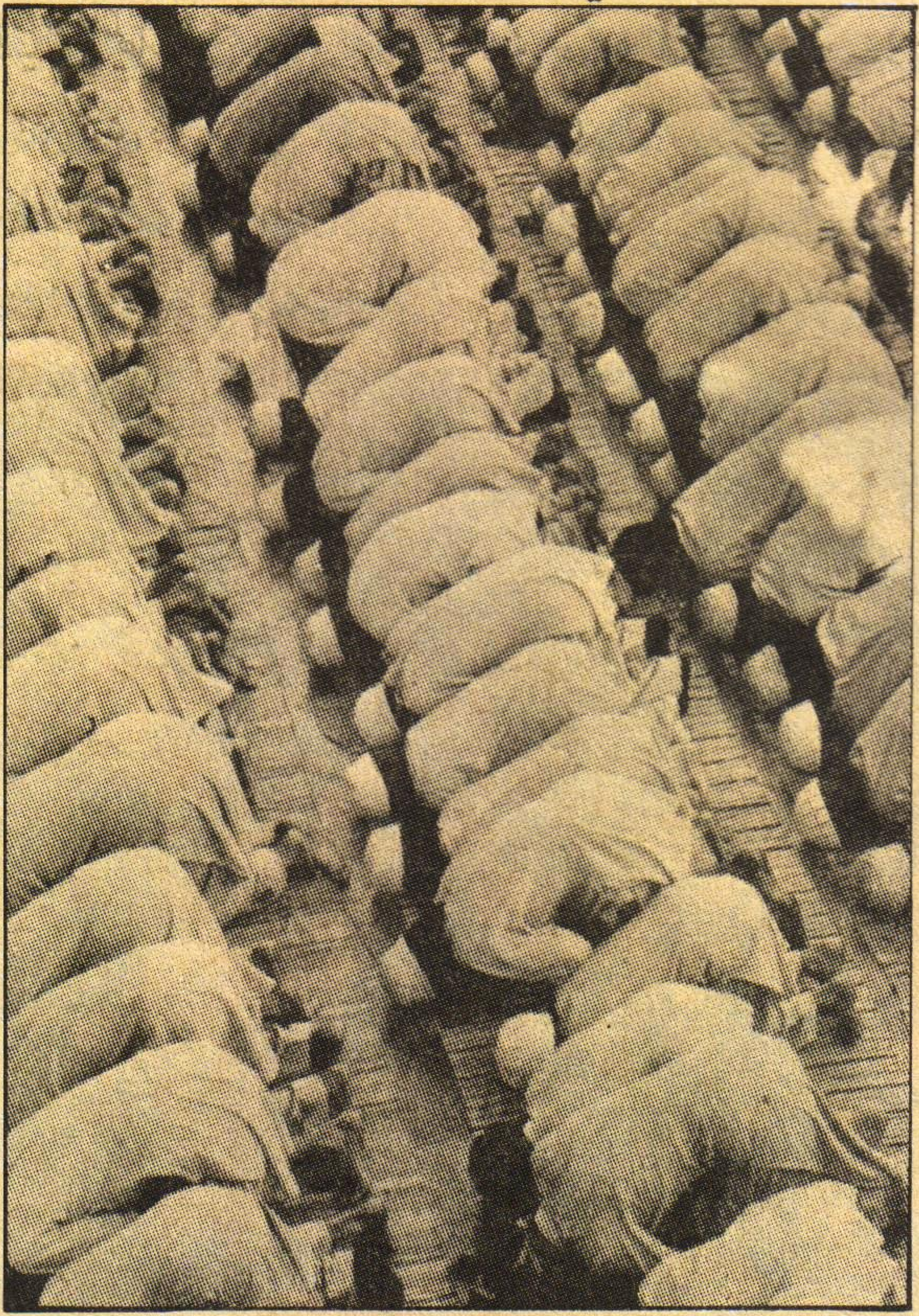
آج بھی نواز شریف ایک ایسا اسلام لانا چاہتے ہیں جو ان کی ذاتی آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکے۔ وہ خادم اسلام بننا نہیں چاہتے بلکہ شریعت کو اپنی خدمت پر مامور کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ دستور کی پندرہویں ترمیم کا بل جسے بظاہر نفاذ شریعت کا بل کہا جا رہا ہے دراصل شریعت کی محکومی کا منصوبہ ہے۔ اس بل میں یہ بات تو کہی گئی ہے کہ شریعت ملک کا سپریم قانون ہو گا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ موجودہ سینیٹ جو اس وقت نواز شریف کی راہ میں رکاوٹ ہے اسے غیر مؤثر کر دیا جائے۔ پاکستانی دستور کی دفعہ ۲۳۹ کے مطابق کسی دستوری ترمیم کے لئے قومی اسمبلی اور سینیٹ میں علیحدہ علیحدہ دو تہائی اکثریت کی حمایت لازمی ہے۔ مجوزہ دستوری ترمیم میں سینیٹ کی اہمیت ختم کر دی گئی ہے۔ نئی اسکیم کے مطابق کسی دستوری ترمیم کے لئے قومی اسمبلی اور سینیٹ کے مشترکہ اجلاس میں دو تہائی

اکثریت کا حصول کافی ہوگا۔ واضح رہے کہ قومی اسمبلی میں ۲۱۷ اراکین ہیں جب کہ سینیٹ میں صرف ۸۷ نشستیں ہیں۔ مشترکہ طور پر دو تہائی کی حمایت لازم کرنے کا سیدھا سا مطلب یہ ہوگا کہ نواز شریف جو چاہیں کریں، سینیٹ ان کی راہ میں حائل نہیں ہوسکے گی۔ دیکھا جائے تو پندرہویں دستور کے ذریعے دراصل نواز شریف اپنی شہنشاہیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس ترمیم سے انھیں صرف اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کا موقع نہیں ملے گا بلکہ وہ شریعت کے نام پر ہر قسم کی ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل کرلیں گے۔ پھر وہ اپنے حامیوں کی اکثریت کے بل بوتے پر جس چیز کو چاہیں گے شریعت باور کرائیں گے اور جو چیز انھیں پسند نہ آئے گی اسے شریعت سے خارج کردیں گے۔

کتاب وسنت قانون کا سرچشمہ ماخذ تو ضرور ہوگا لیکن اس کی تشریح و تعبیر کا حق تو بہر حال نواز شریف اور ان کے حامیوں کو ہوگا۔

نواز شریف نے شریعت بل کے ذریعے صرف شریعت کا راستہ نہیں روکا بلکہ شریعت کے حوالے سے متحرک دینی جماعتوں کے پیروں تلے زمین بھی کھینچ لی ہے۔ جب حکومت خود ہی شریعت کی نگہبانی کا کام اپنے ذمے لے لے تو دینی جماعتوں کے لئے یہ باور کرانا بہت مشکل ہوجاتا ہے کہ ان کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ پھر جو لوگ اب تک نظام اسلامی کے قیام کے لئے متحد تھے ان کے خیمے میں بھی شریعت بل کے حوالے سے کئی آراء پیدا ہوگئی ہیں۔ خاص طور پر جماعت اسلامی کے لئے شریعت بل کی مخالفت بھی مشکل ہے اور حمایت بھی مشکل۔ مخالفت سے شریعت کی مخالفت کا الزام لگتا ہے اور حمایت سے شریعت کے نام پر بے دین عناصر کی اجارہ داری قائم ہوتی ہے۔ نواز شریف نے شریعت بل سے ایک ساتھ کئی شکار کئے ہیں۔ اگر ان کے ہاتھوں سے اقتدار پھسل جاتا ہے تو وہ اپنے سینے پر شہید شریعت کا تمغہ سجانے میں کامیاب ہوجائیں گے اور ملک کے سادہ لوح مسلمانوں کو ان کے لئے یہ باور کرانا بھی آسان ہوگا کہ جب وہ شریعت کے نفاذ کے لئے آمادہ ہوئے تو خود دینی جماعتیں ان کی مخالفت پر آمادہ ہوگئیں۔ دیکھا جائے تو نواز شریف کے اس اقدام نے دینی جماعتوں کے غبارے سے وقتی طور پر ہوا نکال دی ہے۔ جو لوگ اب تک نفاذ شریعت کی مہم چلاتے تھے اب انھیں شریعت بل کی مخالفت میں اپنی قوت صرف کرنا پڑ رہی ہے۔

یہ بات بھی کسی لطیفہ سے کم نہیں کہ ایک مسلم مملکت میں شریعت کی بالادستی جمہوریت کے رحم و کرم پر ہو۔ اللہ کی شریعت ملک کا سپریم قانون بننے کے لئے اراکین قومی اسمبلی کی نگاہ کرم کا محتاج ہو۔ اس سے بڑی مضحکہ خیز بات کیا ہوگی کہ مسلمانوں کے ایک ملک میں کتاب وسنت کو دستور حیات بننے کے لئے کوئی نصف صدی سے سیاسی مسلمانوں کے ووٹوں کا انتظار کرنا پڑے۔ کیا انسانوں کے کسی اسمبلی کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ کی شریعت کو دستور اساسی بننے کے سلسلے میں حکم کا کردار ادا کرے؟ کیا قومی اسمبلی کو یہ حق دے کر ہم شریعت کی توہین نہیں کر رہے ہوتے ہیں؟

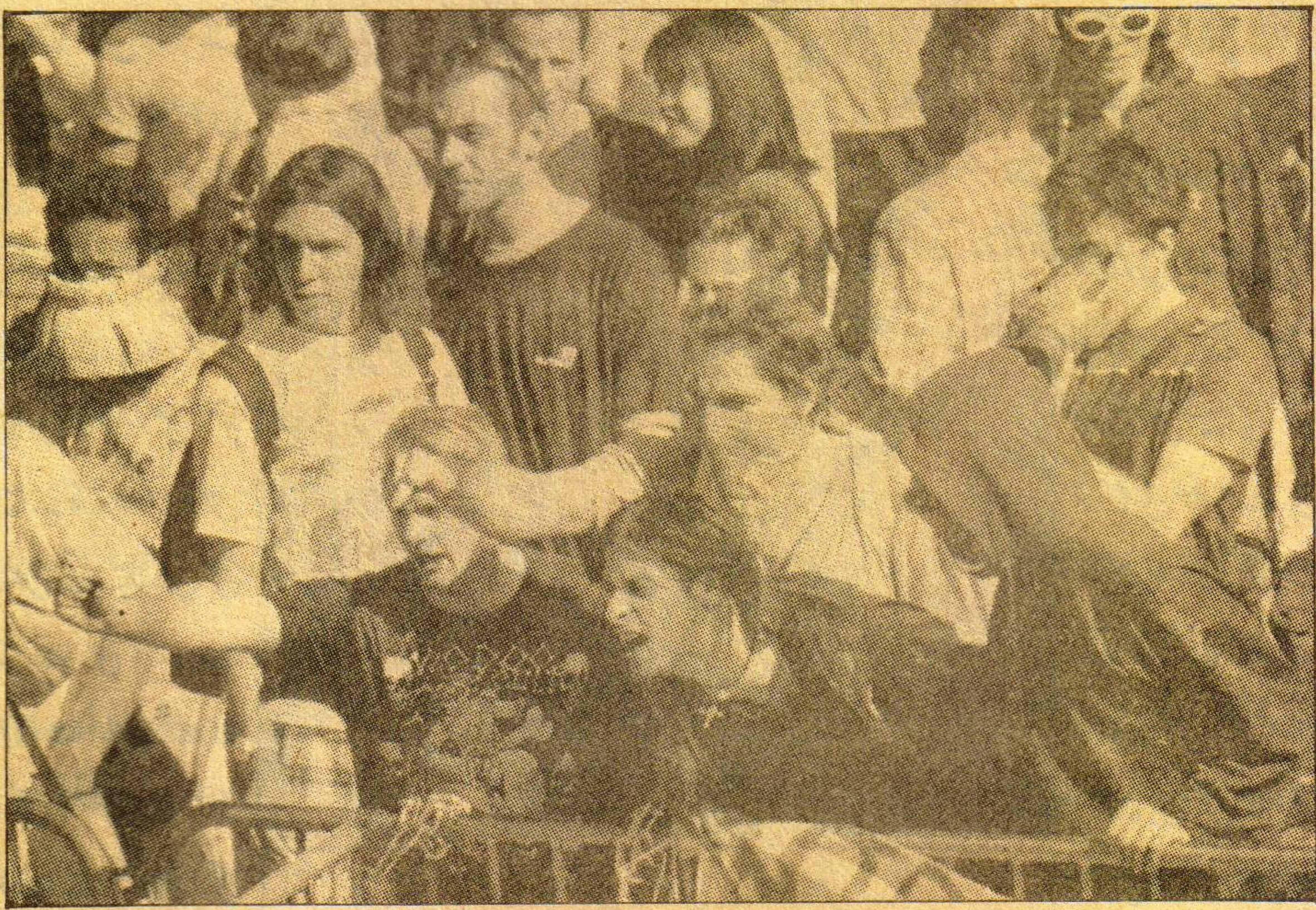


میں جو سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

کیا شریعت کے نفاذ کا راستہ کچے پکے مسلمان کی قومی اسمبلی سے ہو کر گزرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو شریعت بل کے حوالے سے پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان میں شریعت کی بالادستی اور اس کے نفاذ کا کام نہ تو منحرف مسلمانوں کی قومی اسمبلی سے انجام پاسکتا ہے اور نہ ہی اللہ کی شریعت ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انسانوں کی کوئی قومی اسمبلی یا پارلیمینٹ شریعت کی بالادستی کے سلسلے میں کوئی حکم صادر کرے اور نہ ہی اللہ کی شریعت کسی ایسی دستوری ترمیم کی محتاج ہے۔ فی نفسہ یہ خیال کہ جمہوری طریقہ کار سے شریعت کو تفوق ملے یا شریعت کے نفاذ کے لئے دو تہائی اکثریت کی حمایت لازمی ہو ایک غیر اسلامی اور کافرانہ خیال ہے۔ اسلام کسی ایسی حمایت کے حصول اور کسی ایسی اسمبلی کا قائل نہیں جو اسمبلی غیر اسلامی جمہوری بنیادوں پر وجود میں آئی ہو، جس کا وجود ہی غیر شرعی ہو۔ بھلاوہ شریعت کے نفاذ کا کام کیسے انجام دے پائے گی۔ جمہوری طریقے سے تو جمہوری قوانین ہی ترتیب پائیں گے۔ کسی بات کی صداقت کے لئے صرف یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ کتاب وسنت میں اس کی حمایت میں دلائل موجود ہیں۔ جب تک دو تہائی اکثریت آپ کے ساتھ نہ ہو کتاب وسنت کی تمام دلائل دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ پھر یہ کیسی اسلامی مملکت ہوگی جہاں اسلامی قوانین نفاذ کے لئے ہر لمحہ خود کو دو تہائی اکثریت کی حمایت پر مجبور پائیں گے۔ جو لوگ اسلام کو جمہوریت کے راستے لانا چاہتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ▭

کیا تعلیم سے دین کا احیاء ممکن ہے؟

تعلیم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب کی ترقی نے مسلمانوں کو کئی دہائیوں تک مبہوت رکھا ہے اور امت کے بہت سے افراد کو ایک گہرے احساس کمتری نے جکڑ لیا ہے جو مغرب اور اپنی کامیابیوں کے درمیان وسیع فرق کی بنیاد پر مغربی دنیا کے سائنس اور تعلیم کے اداروں کو پر شوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے انھیں حقیقی ترقی اور احیاء کا نمونہ سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فرق بہت بڑا ہے خصوصا جب ہم دیکھتے ہیں کہ ناخواندگی اور پسماندگی مادی زندگی کے ہر شعبے میں مسلمان کا وصف بن گئی ہے اور اس حد تک کہ زراعت سے فوجی تنظیم اور اشیاء صرف تک ہم مغرب کے دست نگر بن کر رہ گئے ہیں۔ مغرب پر ہمارا انحصار اس درجہ بڑھ چکا ہے کہ بعض مسلمان سمجھنے لگے ہیں کہ موجودہ پستی سے نکلنے کا واحد ذریعہ تعلیم کا حصول ہے۔ جب مسلمان اسی پائے کی تعلیم حاصل کر لیں گے جو مغرب حاصل کر چکا ہے تبھی ان کے مسائل حل ہو سکیں گے۔



درحقیقت بہت سے مسلمانوں کا عقیدہ بن چکا ہے کہ اپنی ذاتی کوششوں سے انجینئر، وکیل، ڈاکٹر اور سرجن بن کر ہی احیاء کے عمل میں وہ حقیقی معنوں میں اپنا تعاون دے سکتے ہیں۔ اسلامی عقائد اور امت اسلامیہ کے شاندار سائنسی اور تعلیمی ورثے کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اکیڈمک مفہوم میں تعلیم کی سطح کو بلند کر کے احیاء کا مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ تعلیم کی سطح کی بلندی تو بذات خود احیاء کا نتیجہ ہوتی ہے۔

جزیرہ نمائے عرب اور مغربی دنیا میں احیاء کی جڑیں:

اگرچہ قبل اسلام کے بدوی عرب ایک وسیع ادبی ورثے کے مالک تھے جس نے انھیں زبان، شاعری، خطابت اور حافظے میں ماہر بنا دیا تھا تاہم ان کے درمیان شفوی روایت پر ہی مبنی تعلیم و تعلم کا ایک ایسا نظام رائج رہا جس میں نسبتاً معدودے چند افراد ہی پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ تیکنیکی یا دیگر علمی امور سے جو مادی ترقی سے ہمکنار کر سکیں مثلاً زراعت، اقتصادیات، فوجی تنظیم، طبیعیات اور فن تعمیر وغیرہ میں قابل ذکر علم اور واقفیت سے بڑی حد تک خالی تھے۔ تاہم اسلام کے طلوع کے ساتھ ان کی حالت بدل گئی اور چند صدیوں کے اندر ہی انھوں نے ٹیکنولوجی کے میدان میں نمایاں ترقیوں کا مظاہرہ کیا اور آج سے بہت پہلے دنیا کی نمائندہ قوم بن گئے، نہ صرف سیاست اور ٹیکنولوجی کے میدان میں بلکہ سائنس اور تعلیم کے تمام شعبوں میں بھی۔

ماضی قریب میں اسی طرح کا ایک موڑ مغربی دنیا میں رونما ہوا جو اسلامی دنیا کی برتری کے دور میں حد درجہ پسماندہ اور وحشیانہ حالت میں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ دو صدیوں کے دوران یوروپ اور امریکہ دنیا کے قائد بن گئے ہیں اور وہی تعلیم، ٹیکنولوجی اور سائنس کے عالمی پیمانوں کا تعین کر رہے ہیں تو پھر اس انقلابی قلب ماہیت کا کیا سبب تھا؟ بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس کی کلید تعلیم کے ہاتھ میں تھی۔ عربوں کو لکھنے پڑھنے یا خواندگی سے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے روشناس کرایا۔ رسول اللہ نے مثال کے طور پر جنگ بدر کے ہر قیدی کو جرمانے کے طور پر یہ کام سونپا کہ وہ دس مسلمانوں کو پڑھنا اور لکھنا سکھائے۔ بعد کے زمانے میں اسلام نے پہلے اسکول اور یونیورسٹی کے قیام کی راہ دکھائی اور تعلیم کے میدان میں یہی پیش رفت ہے جس سے مسلمانوں کی ترقی کو منسوب کیا جاتا ہے۔

ایسی ہی ایک کہانی مغرب میں بھی پیش کی جاتی ہے جہاں اسکول اور اس

کے بعد کے مراحل کی تعلیم ہر سطح پر حد درجہ مصنوعی ہے اور جس تک آبادی کی ایک بڑی اکثریت کی رسائی ہے۔ بعض مسلمان اسے مغربی دنیا کی ہم عصر ترقی کے اصل سبب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے مطابق وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امت اسلامیہ کے مرتبہ و مقام کے تنزل کا سبب یہ ہے کہ مسلم دنیا سے اس طرح کے ادارے اور عام تعلیم کی سہولت ختم ہو چکی ہے اور پھر یہ نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے کہ امت اسلامیہ اس تنزلی کا خاتمہ کر کے ہی ترقی کر سکتی ہے لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔

نظریہ۔ ذہنی ترقی کی اساس:

تاریخ اسلام اور دیگر تہذیبوں کے جائزے سے یہ بات واضح ہے کہ تعلیمی ترقی الگ سے وجود میں نہیں آئی اور نہ ہی کسی خاص فرد یا عالم کے ذاتی اقدامات سے۔ مثال کے طور پر یوروپ میں اس نوعیت کی ترقی ریفارمیشن کے پس منظر میں رونما ہوئی جس سے پہلے عوام کی باگ ڈور سخت گیر کلیسا کے ہاتھ میں تھی جس نے گیلیلیو اور کاپرنیکس جیسے عبقریوں کو اذیت اور سزائے موت دے کر ذہانت اور علمیت کی شدت سے حوصلہ شکنی کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان دونوں کے سائنسی حقائق کے انکشافات نے مسیحی مذہبی عقائد کی مقبولیت کے لیے خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ تعلیم، تحقیق اور دانشوری کے میدانوں میں ترقی کی سطح یوروپی اقوام کی سرمایہ داری کے نظریے کے اختیار کرنے کے بعد سے ہی بلند ہو سکی اور دنیا کے سامنے صنعتی انقلاب جیسے واقعات رونما ہونے لگے۔

یہی بات مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کے نظریہ اسلام کی تبلیغ اس کے احکامات کی تشریح اور ترقی کی ترغیب کے نتیجے میں ہی نمایاں تبدیلیاں سامنے آنے لگیں۔ ان تبدیلیوں کو مزید آگے بڑھانے میں صحابہ کرام کی کوششوں کا ہاتھ تھا۔

نظریہ کسے کہتے ہیں؟ یہ زندگی کے متعلق ایک زاویہ نگاہ ہے جس سے انفرادی اور سماجی زندگی کے امور کو منظم کرنے کا ایک نظام ابھرتا ہے جو مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور جو ایک ایسی بنیاد فراہم کرتا ہے جس کی مدد سے سماج ترقی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اسلام اور سرمایہ داری دونوں ہی اس کی مثالیں ہیں۔ جب کوئی قوم ایک نظریے سے وابستہ ہوتی ہے تو اس کا معاشرہ اپنا ایک مطمح نظر اور

وہی صورت حال آج بھی قائم ہے کہ امت کا دانشور طبقہ تو طب، انجینئرنگ، فزکس وغیرہ کی تعلیم میں لگا دیا جاتا ہے اور کمتر استعداد اور کارکردگی والے افراد کے پاس مدرسے میں داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ اس طرح یہ تصور قائم ہو گیا ہے کہ تعلیم کا اعتبار دین میں نہیں ہے بلکہ سیکولر سائنسوں میں ہے۔

اسلام میں اللہ کے دین کا نفاذ، مسائل حیات کو اس کے ذریعے حل کرنے کی کوشش اور اس دین کو باقی بنی نوع انسان تک پہنچانے کا جذبہ ایسی باتیں ہیں جو اس کی سمت مقرر کرتی ہیں اور یہی وہ عوامل بھی ہیں جو تعلیم اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ترقی کی رفتار کو تیز تر کرتے ہیں۔

ایک سمت سفر معین کرتا ہے۔ اسلام میں اللہ کے دین کا نفاذ، مسائل حیات کو اس کے ذریعے حل کرنے کی کوشش اور اس دین کو باقی بنی نوع انسان تک پہنچانے کا جذبہ ایسی باتیں ہیں جو اس کی سمت مقرر کرتی ہیں اور یہی وہ عوامل بھی ہیں جو تعلیم اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ترقی کی رفتار کو تیز تر کرتے ہیں۔

اس رفتار ترقی میں مزید اضافہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ جب قومیت بعض نظریات کو اختیار کرتی ہے تو ان نظریات کا اظہار خود بخود ریاستوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ جب رسول اللہ نے دین اسلام پیش کیا تو اس پر عمل افراد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ ایک ریاست کے قیام کا تقاضہ کرتا تھا۔ عین اسی طرح جب مغرب میں سرمایہ داری کے نظریے کو اختیار کیا گیا تو اس کا سروکار بنیادی طور پر ریاست کے اعمال اور ذمہ داریوں اور حکومت سے تھا۔ تعلیم کے تعلق سے یہ ایک لازمی عنصر بن جاتا ہے کیونکہ ریاست ہی تعلیم کے لیے ایسے ضروری حالات پیدا کر سکتی ہے جن کے تحت تعلیمی اداروں، لیباریٹریوں کے قیام اور مالی امداد کی فراہمی کے ذریعے تعلیم کو عوام تک پہنچایا جا سکے اور صحیح معنوں میں کسی ترقی کے وقوع کی یہی بنیادی شرائط بھی ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تعلیمی یا سائنسی ترقی کے لیے نظریاتی احیاء لازمی اساس کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ تعلیمی اور سائنسی ترقی بذات خود اس طرح کے احیاء کی محض علامت ہے۔ اسلام میں خود زندگی کی اساس اور مقصد دونوں کا تعین اسلامی عقیدے سے ہی ہو جاتا ہے اور اس مقصد کے اظہار کا طریقہ شریعت کے نفاذ میں مل جاتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ذہنی یا اکیڈمک تعلیم کے ابتدائی مراکز اسلامی ریاستوں مذہبی تعلیم کے مراکز سے ابھرے ہیں یعنی کہ مسجد سے اور اگر اسلام کی تاریخ میں منظر عام پر آنے والے عالموں اور دانشوروں کی تعداد پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کے علم کی بنیاد دین کے علم پر ہی تھی یعنی اسلامی طرز فکر میں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب علم کو ہم انفرادی اور سماجی زندگی کے مقاصد سے منقطع کر دیں گے تو اکیڈمک تعلیم کا حصول بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا کہ تعلیم کا احیاء سے وہی رشتہ ہے جو پھل کا درخت سے۔ تعلیم احیاء کے ثمرات میں سے ہے۔ وہ نظریہ جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی درخت کی جڑوں کی حیثیت رکھتا ہے۔

درخت کی نشوونما اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی جڑیں ہوں اور وہ مضبوطی سے قائم بھی ہوں۔ اگر جڑیں کمزور اور ناکارہ ہوں تو درخت کا بھی نشان باقی نہیں رہتا۔ یہ دعوی کرنا کہ پھل بذات خود اپنی غذا کا ذریعہ ہیں کٹ حجتی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے اس امید میں اکیڈمک اور سائنٹفک تعلیم کا مطالبہ کرنا کہ وہ صحیح احیاء کی راہ دکھائے گی، نادانی ہے۔ بلکہ یہ اس نظریے کی تجدید اور اصلاح کا مطالبہ کرنا ہوگا جو تعلیمی ترقی کی راہ پر لے جاسکے گا۔

اسلامی ریاست کے زوال کے اسباب:

اسلامی ریاست کے زوال اور تعلیم کے میدان مسلمانوں کی خدمات کی تفہیم کے بحران کے لیے کئی عوامل کو ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اولین اور نمایاں ترین عنصر اپنے دین کو ایک آئیڈیالوجی کے طور پر سمجھنے میں مسلمانوں کی صلاحیت کے زوال کا ہے۔ ابتدائی دور کی کامیابی سے مطمئن ہوجانے کے بعد جو رسول اللہ اور ان کے صحابہ کرام کی مرہون منت اور جس کی بنیاد فکری اور نظریاتی احیاء پر تھی ان پر ایک فکری انحطاط کی کیفیت چھاگئی۔ رفتہ رفتہ مسائل حیات کا حل پیش کرنے والے ایک فکری اصول کی حیثیت سے دین کی تفہیم کی صلاحیت معدوم ہوتی گئی اور انھوں نے دین کو رسوم اور معاشرت سے متعلق عام معمولات میں بدل ڈالا۔

یہاں سے مسلمانوں اور ان کی ریاست پر یوروپی اقوام اور ان کی نوزائیدہ سرمایہ پرستانہ فکر کے حملے کا راستہ ہموار ہوگیا۔ اس حملے کا رخ ریاست کے تعلیمی نظام کی طرف بھی تھا۔ چنانچہ نوآبادیاتی عہد میں مذہبی مراکز کو اکیڈمک تعلیم کے مراکز سے الگ کردیا گیا جس سے یہ یقینی ہوگیا کہ مذہبی مطالبات کی راہ اختیار کرنے والے لوگ اکیڈمک اور سائنٹفک تعلیم سے محروم رہیں گے اور سائنسی تعلیم حاصل کرنے والے مذہبی تعلیم سے بیگانہ رکھے جائیں گے۔ یہ حملہ واقعی کامیاب ثابت ہوا کیونکہ وہی صورت حال آج بھی قائم ہے کہ امت کا دانشور طبقہ تو طب، انجینئرنگ، فزکس وغیرہ کی تعلیم میں لگادیا جاتا اور کمتر استعداد اور کارکردگی والے افراد کے پاس مدرسے میں داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ اس طرح یہ تصور قائم ہوگیا ہے کہ تعلیم کا اعتبار دین میں نہیں ہے جیسا کہ ماضی میں صورت حال تھی، بلکہ سیکولر سائنسوں میں ہے۔

سیکولر تعلیم کی حقیقت:

مسلمانوں کے لیے اصول دین کا فہم جو ان کے مقصد حیات کا تعین کرتے ہیں اور ان پر عمل ہی بنیادی تعلیم ہے اور اس کا حصول ہر فرد پر واجب ہے۔ اس طرح کسی اسلامی ریاست کی تعلیمی پالیسی کا رخ بنیادی طور پر دین اسلام کی واضح تفہیم پیدا کرنے کی طرف ہونا چاہیے۔ تاہم آج بہت سے مسلمانوں میں اس دین کے صحیح فہم کی کمی ہے جو در اصل حقیقی احیاء کی اساس ہے۔ اس کے باوجود وہ سمجھتے یہی ہیں کہ اکیڈمک تعلیم کے میدان میں نمایاں رہ کر ہی وہ مسلمانوں کی فلاح کا حق ادا کرسکیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ طرز فکر فرد اور امت دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔

سیکولر تعلیم کی حقیقت خصوصاً مغرب میں یہ ہے کہ یہ اکیڈمک تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی مسخ شدہ تصویر بھی پیش کرتی ہے اور تمسخرانہ انداز میں بتاتی ہے کہ مسلمان کیسے رہتے ہیں اور سلوک کرتے ہیں۔ مسلم ممالک کے طلباء کو وہ اقدار سکھائی جاتی ہیں جو اسلام سے علاقہ نہیں رکھتیں مثلاً آزادی، ڈیموکریسی اور سیکولر طرز زندگی سے رغبت وہ نظریہ ارتقاء کو اختیار کرتے ہیں نہ کہ اس عقیدے کو کہ پوری کائنات کا خالق اللہ ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ اقتصادیات کا سبق سیکھتے ہیں نہ کہ اللہ کے احکام کی حکمرانی کا۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ سیکھتے ہیں مسلمانوں کے اسلامی احیاء کی راہ میں رکاوٹ ہی بنتا ہے۔

جہاں تک سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مقصد کو ان کے علم سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کے اذہان کفار کی لیبارٹریوں میں خرچ ہورہے ہیں تاکہ خود کفار کے مادی مقاصد کی تکمیل ہوسکے۔ مثلاً مسلمانوں پر گرائے جانے والے بموں کی تیاری اور مسلمانوں کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کی منصوبہ سازی۔ سچ تو یہ ہے کہ مغربی یونیورسٹیوں میں تربیت یافتہ ذہنوں کی خاصی تعداد کے باوجود ان کے اصل وطن میں کسی بھی میدان میں حقیقی اور بامعنی ترقی کے آثار تک دیکھنے کو نہیں ملتے۔ جب یہ لوگ اپنے ملکوں کو لوٹ آتے ہیں تو بھی یہ ممالک ایسی فکری سمت سے محروم رہتے ہیں جہاں ان فارغین کی صلاحیتیں بروئے کار لائی جاسکیں۔ ایک نمایاں مثال مصر کی ہے جو یہ دعوی ضرور کرتا ہے کہ اس کے پاس پی ایچ ڈی ڈگری ہولڈروں کی بڑی مقدار ہے پھر بھی وہ کسی صنعتی، اقتصادی اور ٹیکنولوجکل پروجیکٹ کو چلانے میں مغربی وسائل کا محتاج رہتا ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ تعلیم کسی سماج کے احیاء کی علامت ہے نہ کہ اس کی اساس۔ اس طرح ہم مغرب کو اپنے آئیڈیل اور اقدار کا معیار تصور کرنے کا خیال ذہن سے نکال دیں، سیکولر تعلیم کے حصول کی بے وقعتی کا احساس کرلیں، اپنے دین کی صحیح فکری تفہیم سے گریز کے رویے کو ترک کردیں کیونکہ یہی صحیح فکری تفہیم امت اسلامیہ کے احیاء کی حقیقی بنیاد ہے۔ اسی تفہیم کے زوال کے باعث ہی تمام شعبوں میں دنیا پر غالب رہنے کی ہماری صلاحیت کو ختم کرکے ہمیں ایک کنارے پھینک دیا ہے اور اس مسئلے کا حل ہے دین کا احیاء۔ اس کے تحت امت کو بنیادی سروکار اپنے معاملات زندگی کو ایک خاص نہج اور نظام سے مربوط کرنا ہوگا جو ہمارے دین کے اصولوں کی تکمیل اور ان کی پیروی سے ممکن ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی نظریاتی ریاست تشکیل پائے گی جو تعلیم اور سائنس کے تمام شعبوں میں ترقی کے لیے مناسب ماحول، سہولتیں اسی طرح فراہم کرے گی جس طرح اس نے ماضی میں کیا تھا اور پھر ہم انشاء اللہ امت کو حقیقی ترقی کی ایک روشن مثال کی حیثیت سے دنیا کی قیادت کرتے ہوئے دیکھ سکیں گے۔

اسلامی ایران میں الٹی دوڑ کا آغاز

غالی شیعیت اور غالی مغرب زدگی ملک میں واپس آیا چاہتی ہے

گذشتہ دنوں نیویارک میں ایرانی صدر خاتمی نے اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا اور اس کے بعد ہی رشدی کے حوالے سے ایران کے موجودہ موقف کی جس طرح وضاحت کی گئی اس سے یہ بات تو واضح ہو گئی ہے کہ اب ایران میں تجد دپسندوں کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایران اس وقت فکری سطح پر سخت خلفشار سے دوچار ہے۔ خمینی کے حامیوں کی گرفت رفتہ رفتہ کمزور پڑتی جارہی ہے اور اب وہ لوگ ملک کی باگ ڈور پر اپنی گرفت مضبوط کرتے جارہے ہیں جن کی پیاسی ناآسودہ روحیں نہ جانے کب سے مغربی تہذیب سے متمتع ہونے کے لئے بیتاب ہیں۔



کہا جاتا ہے کہ ایرانی انقلاب کے بیس سال بعد ملک میں جو نیا ثقافتی انقلاب آیا ہے اس نے پھر سے اتھل پتھل کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ بظاہر یہ ثقافتی انقلاب جسے فٹبال انقلاب کا نام بھی دیا جاتا ہے سابقہ انقلاب سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ ملک بھر میں امریکی ثقافت کے لئے دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ وہی لوگ جو کل تک امریکہ کو شیطان بزرگ سمجھتے تھے اور جو "مرگ بر امریکہ" کا نعرہ لگاتے ہوئے نظر آتے تھے اب امریکی کھلاڑیوں، گویوں اور مسخروں کے استقبال میں اپنے دامن و دل بچھائے دیتے ہیں۔ نوبت بایں جارسید کہ کل تک جو ایران اقوام متحدہ کو ایک اسلام دشمن ادارہ سمجھتا تھا اور جس کا کہنا تھا کہ مسلمان ملکوں کو اپنے باہمی اختلافات آپس میں حل کر لینا چاہیئے آج وہی ایران کھلے عام اقوام متحدہ کے اجلاس میں اعلان کرتا ہے کہ وہ ایران اور افغانستان کے مسئلے میں ثالثی کے لئے سامنے آئے۔ طالبان جتنے بھی برے سہی وہ ہیں تو اپنے دینی بھائی۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایران کے لئے طالبان کے ساتھ بیٹھنا تو قابل قبول نہ ہو لیکن امریکیوں کے ساتھ بہتر تعلقات کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے حتی کہ رشدی کے سلسلے میں ایک شرعی حکم کو بھی واپس لینے میں اسے کوئی تکلف محسوس نہ ہو۔

رشدی کے مسئلے پر ایرانی حکام کی طرف سے جو مضحکہ خیز بیانات سامنے آتے رہے ہیں اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اب ایران میں الٹی دوڑ کا آغاز ہو چکا ہے۔ صدر خاتمی نے ٹیلی ویژن کے پردوں پر بہانگ دہل یہ بات کہی کہ اب رشدی کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے پھر دوسرے حکام یہ کہتے رہے کہ ایران فتوے کے نفاذ کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے گا اور نہ ہی اب وہ رشدی کے قاتل کو کوئی رقم انعام میں دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان اعلانات سے خود اندرون ایران ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اسلامی حلقوں میں اس مسئلہ پر بڑی تشویش کا اظہار کیا گیا چنانچہ ملک میں عوامی رد عمل کے پیش نظر حکومت بعض مبہم بیانات دینے پر مجبور ہوئی۔ جس میں کہا گیا کہ فتوے کو منسوخ تو نہیں کیا گیا ہے البتہ حکومت نے اپنے آپ کو اس فتوے سے دور کر لیا ہے۔ کوئی دس سال پہلے جب آیت اللہ خمینی مرحوم کے فتوے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے مغربی ممالک نے ایران سے سفارتی تعلقات ختم کر لیا تھا اور جب مغربی ممالک کے سفارت کار ایران چھوڑ کر اپنے ملکوں کو واپس جارہے تھے تو اس وقت ایران میں ایک عام احساس یہ تھا کہ دنیا ہمیں چھوڑ کر چلی جائے ہمیں کچھ پرواہ نہیں، ہمارے لئے تو بس یہ اہم ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کی محبت ہمارے یہاں باقی رہے۔ آیت اللہ خمینی کے اس فتوے کا پوری مسلم دنیا میں زبردست استقبال ہوا حتی کہ وہ لوگ بھی جو خمینی کے بعض شیعہ عقائد کی وجہ سے انھیں ناپسند کرتے تھے ان کے دلوں میں بھی مرحوم خمینی کے لئے زبردست احترام و عقیدت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ سچ ہے کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی محبت میں کفار و مشرکین سے برأت کا اعلان کیا اللہ اس کی قدر و منزلت اور مقبولیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

اب اگر اس اہم نکتہ کو موجودہ ایرانی قیادت سمجھنے میں ناکام رہتی ہے تو اسے بہت جلد یہ محسوس ہو جائے گا کہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کی محبت کو ترک کر کے امریکہ اور برطانیہ سے روابط استوار کرنا ایران کے لئے عزت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ کافر قومیں یہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ آپ عزت و احترام اور قیادت کے منصب پر فائز ہو جائیں۔ ماضی میں ایران کی امریکہ سے قربت کے نتیجے میں جو صورت حال پیدا ہوئی تھی اور جس طرح شاہ ایران ایک بے بس امریکی ایجنٹ کی حیثیت سے ایران کو امریکہ کی کالونی بنانے پر شب و روز عمل پیرا تھا یہ سب کچھ بہت پرانی تاریخ کا حصہ

نہیں۔ اب اگر ایرانیوں کو اسی دور کی طرف واپسی کا شوق ہے تو ان کے اس شوق پر ماتم ہی کرنا چاہیے۔

گو کہ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ خامنہ ای کے گرد جو لوگ جمع ہیں وہ اس بات کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ ایران کا قبلہ مکہ سے واشنگٹن کی طرف مڑنے نہ پائے لیکن اب ایسے لوگوں کے اثرات رفتہ رفتہ ملک کی مشنری پر کم ہوتے جا رہے ہیں۔ پھر ملک میں ایسے شیعہ علماء کی بھی خاصی تعداد موجود ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ خمینی انقلاب نے شیعہ مسلک کو خاصا تحلیل کر دیا ہے۔ وسیع النظری اور سنی دنیا کو متاثر کرنے کے لئے خمینی نے شیعہ فکر میں جو بعض بنیادی تبدیلیاں کیں اس سے شیعہ فکر کا قالب ہی بدل گیا۔ خمینی نے صرف یہی نہیں کیا کہ جو لوگ امام غائب کے منتظر تھے اور کچھ کرنے کے بجائے صرف انتظار کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے انھیں یہ بتایا کہ امام غائب کی آمد کے لئے میدان ہموار کرنا ہمارا کام ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر امام غائب کی موجودگی میں امت کو مرکزیت عطا کرنے کے لئے ولایت فقیہ کا سہارا لیا۔ دیکھا جائے تو قیادت سے خالی شیعی مسلمانوں کے لئے ایک مرکزی قیادت کے لئے نئی فقہ کی تلاش شیعی فکر میں ایک بنیادی تبدیلی تھی۔ ایک بار ایک سنی دانشور کے سوال کے جواب میں آیت اللہ خامنی نے تو برملا یہ بات کہی تھی کہ ایرانی حکومت کو اگر ایران کے مسلمانوں پر حکمرانی کا کوئی اختیار ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ ہم رسول اللہ کے نائب کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ خمینی نے شیعی فکر میں جو بعض بنیادی تبدیلی کی تھی اس سے اس قسم کے نتائج پر پہنچنا عین فطری تھا۔ دیکھا جائے تو اس نکتے پر خلافت اور امامت کے مسئلے پر شیعی اور سنی فکر میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہ جاتا۔

> وہی لوگ جو کل تک امریکہ کو شیطان بزرگ سمجھتے تھے اور جو "مرگ بر امریکہ" کا نعرہ لگاتے ہوئے نظر آتے تھے اب امریکی کھلاڑیوں، گویوں اور مسخروں کے استقبال میں اپنے دامن و دل بچھائے دیتے ہیں۔

انقلاب ایران کے بعد بھی علماء کا ایک مؤثر گروہ خمینی کے ان خیالات کی مخالفت کرتا رہا۔ بعض تنگ نظر علماء شیعیت کے خول سے نکلنے کے لیے آمادہ نہ تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر شیعیت سے سنی مخالفت عناصر کو نکال دیا گیا تو پھر شیعیت میں کچھ بھی باقی نہ رہ جائے گا، شیعی مسلک کی عمارت منہدم ہو جائے گی۔

آج جب ملک میں مغرب زدگی کا سیلاب آیا چاہتا ہے ان تنگ نظر علماء نے بھی اپنا وزن تجدد پسندوں کے پلڑے میں ڈالا ہوا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایران کو وسیع اسلام کا علمبردار بنا کر عالم اسلام کی قیادت کے لئے پیش کیا جاتا رہا اور اس دباؤ میں سنی مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے اگر مزید فکری اصلاح کا سلسلہ جاری رہا تو اس سے ان کی شیعہ شناخت کو سخت خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ان کے لئے مغربی ثقافت میں شیعہ شناخت کو قائم رکھنا زیادہ آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خامنی اور اس قبیل کے وسیع النظر علماء کو خود علماء کے گروہ سے تعاون نہیں مل پا رہا ہے۔ صدر خاتمی اگر اس وقت فیصلہ کن پوزیشن میں ہیں تو صرف اس لئے کہ اب ملک میں دو ہی رجحان قوت پا رہا ہے۔ مذہب کے نام پر سخت گیر شیعیت کی واپسی اور معاشی اصلاحات کے نام پر مغرب سے تعلقات استوار کرنے کا زبردست داعیہ۔ ▭

ملیشیا میں لبرل اسلام کو زوال

انور اور مہاثر کے مابین دراصل اقتدار کی رسہ کشی ہے

ملیشیا ملیشیا میں سابق نائب وزیر اعظم انور ابراہیم کی معزولی پر بین الاقوامی پریس اور خاص طور پر اسلامی حلقوں میں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ شاید انور ابراہیم کی معزولی ملیشیا میں اسلامی تحریک کو کچلنے کی کوشش ہے۔ یہ تاثر بھی عام ہے کہ انور ابراہیم کے بڑھتے اثرات خطے میں اسلامی تحریک کو قوت پہنچا سکتے تھے اس لئے مہاثر محمد نے مغرب کی شہہ پر انور ابراہیم کا پتہ صاف کر دیا۔ بہت سے لوگ مہاثر اور انور کی داخلی کشمکش اور خالصتاً اقتدار کی جنگ کو کفر و اسلام کے مابین معرکہ سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو مہاثر کو اسلام اور اسلامی نظام سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی اسلام کے چمپین سمجھے جانے والے انور ابراہیم نے اپنے عہد اقتدار میں کبھی نظام اسلامی کے قیام کی کوئی بات کی۔ پھر بھی اگر لوگ انھیں اسلام کا چمپین سمجھتے ہیں تو یہ محض سادہ لوحی ہے۔ دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے خود مہاثر بھی اسلام کے قد آور چمپین ہیں جو اپنی خدمت اسلام کے سلسلے میں گذشتہ سال فیصل ایوارڈ سے بھی نوازے گئے ہیں۔

ملیشیا اس وقت جس سیاسی بحران کا شکار ہے یہ کچھ وہی کیفیت ہے جس سے مسلم دنیا کی بیشتر حکومتیں دوچار ہیں یعنی اقتدار کے لئے ہر اس مہرے کا استعمال کرنا جس سے ذرا بھی فائدہ ہو سکے اور چونکہ اصلاحات، انقلاب اور اسلام کے حوالے سے عوامی تائید کا حاصل ہونا آسان ہوتا ہے اس لئے مسلم دنیا کے سیاست داں اسلامک کارڈ کا استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔

انور ابراہیم نوجوانوں کی ایک اسلامی تنظیم سے اٹھے تھے لیکن بہت جلد اس سیڑھی پر قدم رکھ کر وہ اقتدار کے بالاخانے میں کچھ اس طرح داخل ہوئے کہ انھیں کچھ خبر نہ رہی کہ باہر کی دنیا میں اسلامی تحریک پر کیا گزر رہی ہے؟ وہ وزیر تعلیم سے وزیر معیشت اور ساتھ ہی ساتھ نائب وزیر اعظم کے عہدے تک جا پہنچے۔ یہاں تک کہ انھیں ملیشیا میں وزیر اعظم ماثر کے بعد سب سے زیادہ طاقتور سیاسی شخصیت شمار کیا جانے لگا۔ انور اقتدار سے جتنا زیادہ قریب ہوتے گئے اسلام اور اسلامی تحریک سے ان کی وابستگی کم ہوتی گئی۔ کہنے کو تو مسلم نوجوانوں کی سابق انجمن سے ان کی راہ و رسم جاری رہی لیکن دراصل وہ اس طرح کی انجمنوں کو رابطہ عامہ کے شعبوں کی حیثیت سے استعمال کرتے رہے اس لئے کہ اب ان انجمنوں سے وہی لوگ قریب تھے جن کی اسلام سے وابستگی ڈھیلی ڈھالی تھی اور جو ہر صورت حال کے مطابق اپنے اسلام کو ڈھالنے کا ملکہ رکھتے تھے، چنانچہ نام تو اسلامی تحریک اور فکر اسلامی کی احیاء کا لیا جاتا رہا لیکن عملاً اس حوالے سے مغربی تہذیب کو قابل قبول بنانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ انور کے ارد گرد جن لوگوں کا حصار تھا ان کے یہاں اسلام ایک دانشورانہ خیال کی حیثیت سے تو زیر بحث آتا تھا لیکن وہاں اسے عملی زندگی کا منشور بنائے جانے کی کوئی فکر نہ پائی جاتی تھی۔ اس ڈھیلے ڈھالے لبرل اسلام نے بہت سے دنیا داروں کو اسلام کی خدمت کے لئے ملیشیا میں جمع ہو جانے کا موقع دیا۔ چونکہ اسلام کا یہ ایڈیشن اپنے خادموں سے کوئی مطالبہ نہ کرتا تھا بلکہ یہ ان کے دنیا دارانہ مطالبات کی تسکین کا ایک آسان ذریعہ بن گیا تھا اس لئے نئے عہد کے خادمان اسلام کی ایک بڑی تعداد مشرق و مغرب سے کوالالمپور اور پٹلنگجایہ کے شہروں میں اکٹھی ہو گئی۔ انور اسلام کی اس خود ساختہ لبرل تصویر کی علامت تھے وہ اپنی سیاسی اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے اس کے علاوہ اسلام کی دوسری تمام شکلوں کو مسلسل مسترد کرتے رہے۔ اس دوران ملک میں مختلف انداز کی دینی تحریکیں اٹھتی رہیں جو ملیشیا کو ایک صحیح اسلامی مملکت بنانے کا خواب رکھتی تھیں لیکن ان سبھوں کو بزور بازو کچل دیا گیا۔ ابھی چند سال پہلے جب جلاوطن محمد اشعری تھائی لینڈ سے ملیشیا واپس آئے تھے اور دینی حلقوں کی طرف سے ان کی آمد کا والہانہ استقبال ہوا، ملک بھر میں انقلاب کی کیفیت پیدا ہونے لگی تو اشعری کو خفیہ پولیس والوں نے کچھ اس طرح گرفتار کیا کہ اشعری اور ان کے ماننے والے نہ جانے کہاں غائب ہو گئے؟ حالانکہ اشعری کے پاس حامیوں کا ایک

انور ابراہیم نوجوانوں کی ایک اسلامی تنظیم سے اٹھے تھے لیکن بہت جلد اس سیڑھی پر قدم رکھ کر وہ اقتدار کے بالاخانے میں کچھ اس طرح داخل ہوئے کہ انھیں کچھ خبر نہ رہی کہ باہر کی دنیا میں اسلامی تحریک پر کیا گزر رہی ہے؟

انور کے ارد گرد جن لوگوں کا حصار تھا ان کے یہاں اسلام ایک دانشورانہ خیال کی حیثیت سے تو زیر بحث تھا لیکن وہاں اسے عملی زندگی کا منشور بنائے جانے کی کوئی فکر نہ پائی جاتی تھی۔

منظم گروہ بھی تھا جو اب بھی زیر زمین اپنی سرگرمی جاری رکھے ہوئے ہے۔ لیکن اس پوری تحریک کو کچھ اس طرح کچلا گیا کہ مستقبل میں بہت سے کلمہ حق کہنے والوں کی ہمت جواب دے گئی۔ اس وقت بھی انور ابراہیم ملک کی دوسری سب سے طاقتور سیاسی شخصیت تھے لیکن اسلامی حوالے سے اٹھنے والی ایک خالصتاً اصلاحی تحریک کو کچل ڈالنے میں انھیں کچھ تامل نہ ہوا۔

ملیشیا کی ایک اور منظم جماعت حزب اسلامی (PAS) جو بعض چھوٹے صوبوں میں برسر اقتدار بھی ہے انور ابراہیم کے اسلامی کردار کی شاکی رہی ہے۔ PAS کا کہنا ہے کہ انور ابراہیم نے اسلام کے حوالے سے ملیشیا میں جس چیز کو روا رکھا ہوا ہے اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ملک بھر میں سیاحت کے نام پر شب و روز عیاشی کے اڈے تعمیر ہو رہے ہیں۔ ہر روز نئے نئے جوئے خانوں، شبینہ کلب اور شراب نوشی کے اڈوں کا افتتاح ہو رہا ہے۔ سیاحت کے نام پر فحاشی کا سیلاب امڈا آتا ہے۔ حکومت زناکاری پر ٹیکس وصول کرتی اور سیاحت کے نام پر غیر ملکی زائرین کی ہر ناجائز اور ناروا خواہش کی تکمیل کرتی ہے اور یہ سب کچھ ایک ایسی حکومت میں ہو رہا ہے جو اسلام کا نام لیتی ہے۔ جس کے وزیر اعظم کو خدمت اسلامی کا بین الاقوامی ایوارڈ مل چکا ہے اور جس کے نائب وزیر اعظم کی اسلام سے وابستگی کا شہرہ عام ہے۔ یقیناً اسلام کی یہ تصویر اسلامی اصولوں پر قابل قبول نہ ہو لیکن انور ابراہیم کے حواریوں نے اسلام کا جو ایڈیشن تیار کیا ہے اس میں ان باتوں پر اعتراض کرنا ملائیت اور دقیانوسیت سمجھا جاتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک ترقی کا معیار مادی خوشحالی اور بلند و بالا عمارتیں ہیں اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ملیشیا اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک کہا جائے گا اس لئے کہ فی زمانہ دنیا کی سب سے اونچی عمارت ملیشیا میں پائی جاتی ہے۔

جب اسلام کا تصور اتنا ہی ڈھیلا ڈھالا ہو، جب حلال و حرام کی سرحد ایک دوسرے میں ملتی معلوم ہو رہی ہو اور جب منکرات پر ہماری جبین شکن آلود نہ ہوتی ہو تو پھر اخلاقی زندگی کا تباہ ہو جانا کچھ عجب نہیں۔ انور پر غیر اخلاقی حرکتوں کا جو الزام ہے اس بارے میں اصل حقیقت کا علم تو صرف اللہ کو ہے البتہ اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ اب انور ان ہی قانونی مکافات کی زد میں ہیں جن کا سہارا لیکر وہ ماضی میں اسلام کے نام لیواؤں کو کچلتے رہے ہیں۔ داخلی سلامتی کے جن احکام کے تحت وہ آج گرفتار ہیں یا جن کا سہارا لے کر ان کے حامیوں کو خاموش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے یہ وہی پرانے قانون ہیں البتہ آج ان سیاہ قوانین کی زد خود ان کے اوپر آ پڑی ہے۔ ▭

سیکولرزم ایک لغو اور ناقابل عمل تصور ہے

لبرل اور معتدل مسلمانوں سے لندن کے ایک انقلابی جریدے کا خطاب

سیکولرازم زندگی سے مذہب کی بے دخلی کا نام ہے۔ اس کے مطابق انسان صرف اپنی ذاتی زندگی میں مذہب پر عمل کر سکتا ہے۔ یہ نظریہ حضرت عیسیٰ سے منسوب ایک قول "جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو" پر مبنی ہے۔ آج سیکولرازم کا نظریہ پوری دنیا میں ایک معیاری نظریہ مانا جاتا ہے حتیٰ کہ مسلم دنیا بھی اس سے محفوظ نہیں۔ بنیاد پرست اور قدامت پسند جیسی اصطلاحات سے گھبرا کر لبرل اور معتدل کہلانے کے شوق میں مسلمان اس نظریہ کی سمت اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہو رہا ہے کہ اسلام میں مخلوق کی رضا و خوشنودی کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جاتا بلکہ ہر کام میں خالق کی خوشنودی پیش نظر ہوتی ہے۔

سیکولر معاشرہ ہمیشہ ایک بنیادی نوعیت کے بحران سے دوچار رہا ہے۔ یہ بحران اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا بنیادی نکتہ ہے جہاں مذہب ذاتی معاملات سے آگے بڑھ جاتا ہے؟



بحراٹلانٹک کے دونوں جانب اس وقت مذہب پر اضمحلال طاری ہے۔ جون میں امریکی ایوان نمائندگان نے پبلک اسکولوں میں رضاکارانہ طور پر دعا کا قضیہ اٹھایا۔ برطانیہ میں مسلم اسکولوں کو حکومتی مراعات دینے نہ دینے پر کشمکش جاری ہے اور سرکاری اسکولوں میں مذہبی تنظیموں کے کردار پر بحث ہو رہی ہے۔ اسی طرح کی دوہری مشکلات مسلم ملکوں میں بھی سر اٹھا رہی ہیں۔ ایران میں شدت پسندوں اور اعتدال پسندوں کے درمیان ایک نزاع برپا ہے۔ ایک لبرل میئر کے خلاف عدالتی چارہ جوئی اور اعتدال پسند وزیر کی خاتمی کی کابینہ سے بے دخلی کے واقعات اس پر گواہ ہیں۔ اس انتشار سے متاثر ذہنوں میں یہ سوالات اٹھتے ہیں۔

- ❑ وہ کون سی حدود ہیں جو اسلام کے لئے مقرر کی جانی چاہئیں؟
- ❑ کیا اسلام میں سیاست داخل ہے؟
- ❑ کیا مسجدوں میں سیاسی گفتگو ہونی چاہیے؟
- ❑ اسلام ریاست کی بنیاد ہو یا وہی کردار ادا کرے جو مغرب کے سیکولر معاشرہ میں عیسائیت کر رہی ہے؟

سیکولرازم ایک تضاد پر مبنی ہے۔ بطور ثبوت آپ امریکہ کی پہلی آئینی ترمیم دیکھئے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ "کانگریس مذہب کے قیام سے متعلق یا اس پر آزادانہ عمل کی ممانعت کے لیے کوئی قانون نہیں بنائے گی۔"

اس ترمیم سے سیکولرازم میں موجود تضاد بالکل واضح نظر آرہا ہے۔ ایک طرف تو اس کی جانب سے مذہب کا انکار بھی نہیں، دوسری طرف مذہب کے قیام کے لئے کوئی قانونی تائید بھی نہیں کہ مبادا ریاست اور معاشرہ میں مذہب کا کردار لا محدود ہو جائے۔ یہ رویہ سیکولر معاشرہ میں ایسی دوہری مشکلات کا دروازہ کھول دیتا ہے جو بڑی تلون آمیز ہوتی ہیں۔ مثلاً مذہب کے حقارت آمیز انکار اور مذہبی انتہا پسندی کے درمیان خوشگوار راستہ کون سا ہے۔ مذہب کو قتل میں لے جائے بغیر معاشرہ کو مذہبیت سے کیسے بچایا جائے۔ راہ اعتدال کون سی ہے؟ مذہب کا دائرہ کار کتنا محدود ہے یا پھر اس کے برعکس کتنا وسیع ہے؟

مذہب کا دائرہ کار کتنا محدود ہے؟

بہتیرے سیکولر تو یوں پریشان ہیں کہ مذہب تو پہلے ہی بہت الگ تھلک کیا جا چکا ہے۔ یہ "قدامت پسند" لوگ مذہب کی حاشیہ برداری سے پیدا شدہ مسائل کا حوالہ دیتے ہیں جیسے مذہب کی اتحاد پیدا کرنے والی اثر انگیزی جو مذہب کی بے دخلی سے مفقود ہو گئی اور مغربی معاشرہ پر چھایا ہوا اخلاقی بحران۔ ابھی حال ہی میں برطانیہ میں شعبہ تعلیم و روزگار کے سربراہ پروفیسر میخائیل باربر نے تجدید تعلیم کی اخلاقیات کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ سیکولر معاشرہ میں مذہب کو محدود کر دینے کے نتیجے میں جو خلا پیدا ہوتا ہے اسی خلا میں اخلاقی بے حسی کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ پروفیسر لکھتے ہیں کہ وہ خلا چونکہ انفرادیت پسندی اور صارفیت کے تخریبی اثرات سے بھر دیا جاتا ہے اسی لئے اخلاقی ذمہ داریوں سے گریز کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں توازن پیدا کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ مثلاً ۴ جون کو امریکہ میں ایوان نمائندگان کے درمیان ترمیم برائے مذہبی آزادی پر بحث ہوئی۔ اس بحث میں یہ بات بھی آئی کہ "لوگوں کو عبادت کرنے، اپنے مذہبی اعتقادات کو ماننے، اسکولوں سمیت عوامی مقامات پر اپنے رسم و رواج کے مطابق عمل کرنے کا جو حق ہے اسے غصب نہیں کیا جانا چاہئے۔" یہ ہے وہ فکر جو اس حقیقت کے باوجود منظر عام پر آئی کہ پچیس سال سے زیادہ عرصہ گزرا اس سلسلہ میں ایک بھی ترمیم پاس نہیں ہوئی۔

مذہب کا دائرہ کار کتنا وسیع ہے؟

مذہب کے کردار کے سلسلہ میں جاری اس بحث کی وجہ سے جس میں کبھی ایک فریق غالب ہوتا ہے کبھی دوسرا، سیکولرازم کا ایک مخالف نظریہ ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مذہب کو پہلے ہی سے بہت غلبہ حاصل ہے یا دوسرے لفظوں میں مذہب بہت غالب ہے۔ چنانچہ "ڈیموکریٹک ریپبلک امریکا" میں نیویارک کے لوئس سلاٹر نے ارکان کانگریس سے کہا "یہ مذہبی آزادی کی ترمیم خطرناک ہے کیونکہ یہ چرچ اور ریاست میں علیحدگی کی اس دستوری ضمانت کو ختم کرتی ہے، جس کے ذریعہ مذہبی آزادی محدود کی گئی تھی۔ یہ مجوزہ ترمیم درحقیقت سپریم کورٹ کے ان ۳۶ سال کے فیصلوں کی صریح خلاف ورزی ہے جن کی وجہ سے مذہب گوشہ نشین ہوا۔ عدالت کے حالیہ فیصلوں کی رو سے بھی اسکول گراونڈ سے لے کر کلب تک عبادات و مناجات پر پابندی ہے، دوسرے فیصلوں کی رو سے عوامی مقامات پر میلاد مسیح کے مناظر کی نمائش دعائیہ محفلوں کے انعقاد اور ترانہ کرسمس پڑھنے پر پابندی ہے۔

ماضی میں مغربی اقوام نے پاپائیت کی "بے انتہا مذہبیت" کے ہاتھوں بڑے دکھ جھیلے تھے۔ موجودہ تشویش ماضی کے انہی دکھوں کا نتیجہ ہے۔ چند صدیوں پہلے مغرب مسیحی دنیا کہلاتا تھا جس میں عیسائیت آج کی طرح صرف ریاست کا مذہب نہیں تھی بلکہ ریاست اور معاشرہ کی اصل بنیاد تھی۔ اس پاپائیت نے جبر و استبداد اور قتل و خونریزی کی ایک طویل داستان رقم کی ہے چنانچہ بادشاہوں نے عیسائیت کے نام سے رعایا پر اپنا خدائی حق سمجھ رکھا تھا۔ اس المناک تاریخ کے نتیجہ میں راہ اعتدال کے طور پر سیکولرازم کا خواب دیکھا گیا لیکن خواب خواب ہی ہوتا ہے حقیقت کی دنیا سے بہت دور۔

بنیاد پرست اور قدامت پسند جیسی اصطلاحات سے گھبرا کر لبرل اور معتدل کہلانے کے شوق میں مسلمان اس نظریہ کی سمت اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہو رہا ہے کہ اسلام میں مخلوق کی رضا و خوشنودی کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جاتا

اللہ تعالی کی ہدایات ہمہ گیر ہیں۔ "مذہبی" معاملات کی طرح سیاسی مسائل میں بھی۔ ان الٰہی ہدایات کے اتباع کے نتیجہ میں انسانی زندگی کے تمام اعمال میں یکسانیت آجاتی ہے اور زندگی کا بنیادی مقصد اللہ تعالی کی عبادت و اطاعت قرار پاتا ہے۔

مسلمان سیکولرازم کی بحث میں کیوں الجھ گئے؟

مسلمان مغرب میں اور خود اپنے ملکوں میں اس عجیب بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ انہیں بنیاد پرست اور سخت گیر ہونا چاہئے یا معتدل اور ترقی پسند۔ ایران اس کی ایک تازہ مثال ہے۔ مئی ۱۹۹۷ء میں خاتمی کے انتخاب سے اعتدال پسندوں اور قدامت پسندوں کی بحث میں اور تیزی آگئی ہے۔ ۱۰ جون کو اخبار گزارش روز پر پابندی لگادی گئی۔ قدامت پسندوں کی جانب سے اس کی اخلاقیات پر بار بار حملہ کی وجہ سے اخبار کے مدیر کو حراست میں لیا گیا اور پھر رہا کر دیا گیا۔ ۱۲ جون کو سخت گیروں نے تہران کے اعتدال پسند میئر غلام حسین کاربازی کی پھانسی کا مطالبہ کیا۔ مسلم دنیا میں اس طرح کے گوناگوں معرکے نظر آرہے ہیں۔ اس صورت حال کی دوسری مثال پاکستان ہے جہاں ڈاکٹر جان جوزف کی احتجاجی خودکشی نے توہین رسالت کا موضوع چھیڑ رکھا ہے۔ اس بہانہ سے پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ بی ۲۵۹ اور C کی منسوخی کا مطالبہ کر کے امریکہ مسلم ملکوں کے داخلی مسائل میں مداخلت کر رہا ہے۔ امریکہ پاکستان کے اس قانون کو بنیاد پرستی کی علامت قرار دیتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ مغرب میں پیدا ہونے والی اس عجیب بحث و جدال کی بازگشت مسلم ملکوں میں کیوں سنائی دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ دراصل دونوں معاشرے سیکولرازم پر مبنی ہیں۔ ایران، پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک میں اسلام ریاست کی حقیقی بنیاد نہیں ہے سچ تو یہ ہے کہ جو حیثیت مغرب میں عیسائیت کی ہے بعینہ وہی حیثیت مسلم ملکوں میں اسلام کی بھی ہے۔ مغرب میں عیسائیت، اسٹیٹ کا مذہب ہے اور مسلم ملکوں میں اسلام۔ مذہب صرف روحانی معاملات کی نگہداشت کیلئے ہے جبکہ سیاست و معاشرت اور زندگی کے بقیہ دوسرے امور کے لئے پارلیمنٹ قانون سازی کرتا ہے، بشمول ایران و پاکستان دوسرے تمام مسلم ممالک کے دستوروں میں مذکور متعین اصطلاحات سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔

دفعہ ۱۲۔ ایران کا دستوری مذہب اسلام ہے۔ کتب اثنا عشریہ جعفریہ (اصول فقہ و دین میں) اور اس کے اصول ناقابل تبدیل رہیں گے۔ (ایرانی دستور)

حصہ۔ اتعارفی ۲۔ اسلام پاکستان کا ملکی مذہب ہوگا۔ (پاکستانی دستور)

اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ پاکستان اور ایران کو اسلامی جمہوریہ کیوں کہا جاتا ہے۔ جمہوریہ ایک سیکولر ریاست ہوتی ہے اس کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ انسان ہی اقتدار اعلی ہے۔ یہ اپنا قانون پارلیمنٹ یا ایوان کے بحث و مباحثے کے ذریعہ بناتی ہے، ایسے میں پارلیمنٹ کو مجلس شوری کا نام دے لینے سے ملک اسلامی نہیں بن جاتا۔ چنانچہ یہ بالکل واضح ہے کہ اسلام معاشرہ کی ایسی بنیاد نہیں ہے جیسی کہ عیسائیت ہے، نہ ہی عیسائیت کی طرح اسلام کوئی موقت اور علامتی ذریعہ ہے۔

سیکولرازم میں ہمیشہ سے دو نوعیت کے دائرہ کار رہے ہیں ایک وہ جس میں مذہب کو عمل دخل کی بالکل اجازت نہیں اور دوسرا وہ جس میں مذہب کچھ لب کشائی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایران میں مذہبی رہنما صدر مملکت کے پہلو میں بیٹھتا ہے اور پاکستان میں ہائی کورٹ کے ساتھ ساتھ وفاقی شرعی عدالتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

اس پوری بحث و جدال میں بنیاد پرستوں اور اعتدال پسندوں نے معاشرہ کی سیکولر فطرت سے کچھ نہیں پوچھا۔ دونوں طبقے اس پر متفق ہیں کہ معاشرہ سے مذہب کو بے دخل کر دیا جائے۔ اختلاف صرف اس پر ہے کہ یہ بے دخلی کس حد تک ہونی چاہیے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس سلسلہ میں ایران کی بھی وہی بنیادیں ہیں (اور وہی بحثیں جاری ہیں) جو امریکہ کی ہیں۔ وہی امریکہ جسے ایران تقریبا دو دہائیوں سے شیطان عظیم کہتا آرہا ہے۔

سیکولرازم وجود انسانی کی حقیقت کے خلاف ہے۔

سوال یہ نہیں ہونا چاہیے کہ معاشرہ میں مذہب کا دخل زیادہ ہو یا کم۔ یہ سوال تو اس صورت میں اٹھ سکتا ہے جب کہ سیکولرزم کو قبول کرلیا گیا ہو۔ بنیادی سوال تو یہ ہونا چاہیے کہ کیا سیکولرازم قابل قبول ہے؟ کیا مذہب کو معاشرہ سے بالکل جدا کر دینا چاہیے؟

صرف اسی طرح کے سوالات سے سیکولرازم کا حقیقت سے تضاد ابھر کر سامنے آئے گا۔ یہ تو طے ہے کہ سیکولرازم ایک خالق کے وجود کا اقرار کرتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سیکولرازم مذہب کے کردار کو محدود کرنا چاہتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جو چیز کسی کے نزدیک تسلیم شدہ نہیں ہوتی اس کو وہ محدود بھی نہیں کرتا۔ اس اعتراف مذہب کے ذریعہ سیکولرازم، روز قیامت، خالق کے سامنے جواب دہی کا بھی اقرار کرتا ہے اور یہ اقرار اس نظریہ کو چیلنج کرتا ہے کہ اس حاکم کے فیصلے چند معاملات میں تو قبول کرلیے جائیں اور سیاست و معاشرت جیسے دوسرے اہم معاملات میں ان کی پاسداری نہ کی جائے۔ سیکولرازم کا حقیقت سے یہی تضاد ہے جو طول طویل اور بے فائدہ بحثوں کی بنیاد بنا ہوا ہے۔

> پاپائیت نے جبر و استبداد اور قتل و خونریزی کی ایک طویل داستان رقم کی ہے چنانچہ بادشاہوں نے عیسائیت کے نام سے رعایا پر اپنا خدائی حق سمجھ رکھا تھا۔ اس المناک تاریخ کے نتیجہ میں راہ اعتدال کے طور پر سیکولرازم کا خواب دیکھا گیا لیکن خواب خواب ہی ہوتا ہے حقیقت کی دنیا سے بہت دور۔

> سچ تو یہ ہے کہ جو حیثیت مغرب میں عیسائیت کی ہے بعینہ وہی حیثیت مسلم ملکوں میں اسلام کی بھی ہے۔ مغرب میں عیسائیت، اسٹیٹ کا مذہب ہے اور مسلم ملکوں میں اسلام۔ مذہب صرف روحانی معاملات کی نگہداشت کے لئے ہے جب کہ سیاست و معاشرت اور زندگی کے بقیہ دوسرے امور کے لئے پارلیمنٹ قانون سازی کرتا ہے

خلاصہ:

سیکولرازم کے برعکس اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ طے شدہ ہے کہ اللہ تعالی مسلمانوں سے ہر معاملہ میں پوچھ گچھ کرے گا۔ ارشاد ربانی ہے

پیغمبر جو کچھ تمہیں دے رہا ہے وہ لے لو اور جس چیز سے روک رہا ہے اس سے رک جاؤ۔ (TMQ - 59:7)

چنانچہ اللہ تعالی کی ہدایات ہمہ گیر ہیں۔ "مذہبی" معاملات کی طرح سیاسی مسائل میں بھی۔ ان الہی ہدایات کے اتباع کے نتیجہ میں انسانی زندگی کے تمام اعمال میں یکسانیت آجاتی ہے اور زندگی کا بنیادی مقصد اللہ کی عبادت و اطاعت قرار پاتا ہے۔ اسلام اس سے پہلے کبھی ریاست کا مذہب (State Religion) نہیں رہا۔ ہمیشہ معاشرہ اور ریاست کی بنیاد رہا ہے۔ یہ حقیقت اپنے اندر بہت گہرے معانی رکھتی ہے چنانچہ اسلام میں روحانی رہنماؤں اور سیاسی رہنماؤں میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ سیاسی رہنما بھی لازمی طور پر صرف اسلام کی اتباع کرتے ہیں۔ نہ ہی یہاں شعبہ امور مذہبی کی گنجائش رہتی ہے جیسا کہ اس وقت تمام عالم اسلام میں دیکھا جارہا ہے۔ شعبہ امور مذہبی کی موجودگی کا مطلب یہ ہوا (جیسا کہ آج کل حقیقتا ہے) کہ دوسرے شعبے اسلام کے علاوہ کسی اور نظریے کے ماتحت ہوں گے۔ چنانچہ عدالت، معاشرت، معیشت، داخلی اور خارجی مسائل الغرض ریاست کے تمام معاملات اسلام کی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔ اس طرح Islamic Republics کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی جہاں اسلام ایک سرکاری مذہب تو ہوتا ہے لیکن قانون سازی کا اختیار صرف پارلیمنٹ کو ہوتا ہے۔

کیا اس طرح کی بحثوں کو بنیاد بنا کر مسلمان کسی ایسے حل تک پہنچ سکتے ہیں جو انہیں اس قابل بنادے کہ وہ اپنے بنیادی مقصد سے ہم آہنگ ہو کر آگے بڑھ سکیں!!

انتہاپسندی کے خلاف ایران کا اعلان جنگ

حکومت ایران نے خود اپنے یہاں موجود انتہاپسندوں کو کچلنے کے اقدامات کے بعد اب افغانستان میں ایسے عناصر سے نمٹنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ ایک سال پہلے منصب صدارت سنبھالنے کے بعد سے پہلی بار صدر خاتمی کو اسلامی انتہاپسندوں سے پنجہ لینا پڑ رہا ہے، لہٰذا اب دو غیر متعلق واقعات میں اس نے ایک طرف ایران کے اسلامی انتہاپسند گروہوں کے خلاف جنگ کا کھلا اعلان کر دیا ہے تو دوسری طرف سرحد پار طالبان انتہاپسندو کو ایک طرح سے دھمکیاں دے رہا ہے۔ لیکن اگر ایران کو داخلی سطح پر انتہاپسندوں کا زور کرنے میں کامیابی کے امکانات روشن ہیں تو افغانستان میں فوجی مداخلت اس کے لیے مہلک ثابت ہوگی۔

ایرانی حکام کا کہنا ہے کہ اگر انھوں نے گذشتہ ماہ اسی طرح افغانی دہشت گردوں کے مشتبہ کیمپوں پر حملہ کیا ہوتا جیسے امریکہ نے کیا تھا تو امریکہ کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ خود کو دفاعی پوزیشن میں ثابت کرنے کے حقدار اور دعویدار ہوتے۔ گذشتہ ماہ طالبان فوجیوں نے ایک ایرانی صحافی اور دس سفارت کاروں کو پکڑ لیا تھا۔ ممکن ہے کہ انھیں اب بھی یرغمال بنا کر رکھا گیا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ مار ڈالے گئے ہوں۔ دیگر درجنوں ایرانی جن میں زیادہ تر ٹرک ڈرائیور ہیں ان سرکاری فوجیوں کو اسلحہ فراہم کرنے کے الزام میں جیلوں میں بند ہیں جن کی طالبان کے ساتھ ہارتی ہوئی جنگ میں ایران مدد کر رہا تھا۔

ایران کا دعوی ہے کہ طالبان سے اس کی قومی سلامتی کو خطرہ ہے اور یہ کہ ان کی تحریک سے امریکہ، پاکستان اور سعودی عرب کے مفادات کو فروغ مل رہا ہے کیونکہ اس طرح افغانستان پر ایران کے پہلے جیسے اثرات نہیں رہے ہیں۔

استدلال کے اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے اور گذشتہ ماہ کے میزائل حملہ کو نظرانداز کرتے ہوئے ایران سرکاری ریڈیو نے یہ دعوی کیا ہے کہ امریکہ عملاً افغای عوام کے ساتھ پراکسی جنگ میں داخل ہو چکا ہے اور وہاں پر جاری نسل کشی کے لیے پوری طرح ذمہ دار ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایران کے شیعہ مسلمان کٹر ذہنیت والے رجعت پسند سنی مسلم طالبان سے نفرت کرتے ہیں اور انھیں یہ خوف لاحق ہے کہ افغانستان میں شیعہ اقلیت کے خلاف نسلی تطہیر کی تحریک سرگرم ہے جو پناہ گزینوں کے ایک نئے ریلے کے ایران میں داخلے کا سبب بنے گی اور اس طرح ایران میں پناہ گزینوں کی موجودہ ڈیڑھ ملین کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔

ایرانی سفارت کاروں کو طالبان سے رہا کرانے کے دباؤ کے تحت ایران نے ذرا ڈھکے چھپے الفاظ میں افغانستان کو فوجی کارروائی کی دھمکی دی ہے۔ اس دھمکی کو مضبوط کرنے کی غرض سے اس نے فوج اور انقلابی حفاظتی دستے کے ہزاروں جوان صوبہ خراسان میں افغانی سرحد پر تعینات کر دئے ہیں۔ مسٹر خاتمی ہلکے لہجے میں کہا ہے کہ امید ہے کہ ہمیں غیر سفارتی ذرائع کے استعمال پر مجبور نہیں ہونا پڑے گا اور ذرا کم نرم لہجے میں خراسان میں ایک طاقتور گروہ کی نگرانی میں شائع ہونے والے اخبار "قدس" نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ سرحد پر طالبان سے لڑنے کے لیے افغانی پناہ گزینوں پر مشتمل ایک فوج کی تشکیل کی جائے۔



ایران کو طالبان سے خطرہ ہے مگر رشدی اور ان کے حامیوں سے نہیں

لیکن ایران اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ وہ سپرپاور نہیں ہے۔ وہ کسی بھی حملے سے اتنی آسانی سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا جس طرح کہ امریکی حکام نے اپنے میزائل حملے کی جواب دہی سے دامن چھڑا لیا اور ایرانی وزیر خارجہ کمال خرازی کا کہنا ہے کہ سوویتوں کے تجربے کے مطابق افغانستان ایک دھنستی ہوئی دلدل ہے۔ سابق صدر علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے ایران میں آج بھی جن کی رائے کی وقعت ہے، اس پر یہ اضافہ کیا کہ "ہم اس مسئلے کے عاقلانہ اور مناسب حل کی تلاش میں ہیں۔"

ابھی ۱۴ ستمبر کو حکومت ایران طالبان کو ایک ہفتے کی سہولت اس وضاحت کی غرض سے دی تھی کہ لاپتہ سفارت کاروں پر کیا بیتی۔ لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس مدت کے گذر جانے کے بعد ایران کیا اقدام کرے گا۔ ایران کو اندیشہ ہے کہ طالبان سے اس کا تنازعہ غالباً حد درجہ کشیدہ موقف کے طور پر یونہی باقی رہے گا۔

طالبان کی پیش کردہ اسلام کی تعبیر سے ایران کی بیزاری کا تعلق شاید اس

تجربے سے ہے جو اسے خود ایران کے اندر اسلام پسندوں کی سرگرمیوں کو دبانے کے دوران ہوا ہے۔ اسلامی جمہوریہ میں زندگی کا سب سے زیادہ ہتک آمیز پہلو اس کے معاملات میں قانون و ضابطے کو اپنے ہاتھ میں لینے والے اسلام پسندوں کی مداخلت ہے۔ ۱۹۷۹ کے انقلاب کی سرپرستی کے دعویدار یہ اسلام پسند زوال آمادہ مغربی تہذیب کے تمام نشانات کو مٹا دینے کے لیے مستقل اور پر زور تحریک چلائے ہوئے ہیں۔ وہ غیر شادی شدہ جوڑوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ان سنیما ہالوں پر دھاوا بول دیتے ہیں جہاں ان کے خیال میں غیر اسلامی فلم دکھائی جا رہی ہو اور ہر اس شخص سے مار پیٹ کرتے ہیں جو ان سے اختلاف کرے۔

حالیہ چند برسوں میں اسلام پسندوں میں زیادہ جارحیت آئی ہے جیسا کہ جناب خاتمی کے اصلاحی پروگرام کو ناکام کرنے کی ان کی کوشش سے ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ لبرل نقطہ نظر رکھنے والے اخباروں کے دفتروں میں توڑ پھوڑ مچاتے ہیں، سڑکوں پر ہوتے مظاہروں کو منتشر کرتے ہیں اور کچھ دنوں سے یہ بھی ہو رہا ہے کہ حریت پسندانہ ذہنیت والے اماموں کے قطبوں کو رکوا دیتے ہیں۔ ابھی تک وہ کسی گرفت اور سزا سے بچے ہوئے ہیں۔ اپنے سیاسی حریفوں کے ساتھ کھلے تصادم کی نوبت سے بچنے کی کوشش میں کچھ زیادہ ہمت نہیں کر پائے ہیں علاوہ اس کے کہ تشدد کا راستہ ترک کرنے کی تلقین نرم لہجے میں وقتاً فوقتاً کرتے رہیں۔ اس

ایران کا دعوی ہے کہ طالبان سے اس کی قومی سلامتی کو خطرہ ہے اور یہ کہ ان کی تحریک سے امریکہ، پاکستان اور سعودی عرب کے مفادات کو فروغ مل رہا ہے کیونکہ اس طرح افغانستان پر ایران کے پہلے جیسے اثرات نہیں رہے ہیں۔

سے انتہا پسندوں کے حوصلے اور بھی بلند ہوئے ہیں۔

پچھلے دنوں انتہا پسندوں نے دو نمایاں اعتدال پسند لیڈروں پر حملہ کیا جو جناب خاتمی سے کافی قریب تھے اور تہران یونیورسٹی میں نماز جمعہ ادا کر رہے تھے۔ اس حملے میں وزیر ثقافت اور سرکاری ترجمان کی انگلی پر چوٹ آئی جب کہ نائب صدر عبداللہ نوری کو ایسی لاگ لگی کہ ان کی پگڑی چھٹک گئی۔ آخر کار صدر نے غصے میں آکر انتہا پسندوں پر یورش کا یہ کہتے ہوئے حکم جاری کر دیا کہ "ہم تشدد کو پھیلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے چاہے اس میں کسی کا بھی ہاتھ ہو۔ حکام کو چاہئے کہ وہ اس معاملے میں ذرا سی بھی نرمی اور رحمدلی نہ برتیں۔" جناب صدر کی حمایت میں ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ علی خامنہ ای نے پولیس کو، جو ان کی تابع ہے، مجرموں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ممکن ہے کہ انتہا پسندوں نے بہت دور تک جا کر خود کو برباد کر لیا ہو اور اسی طرح طالبان نے بھی ایرانی سفارت کاروں کو پکڑ کر انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہو لیکن یہاں پر بس چند ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ▭

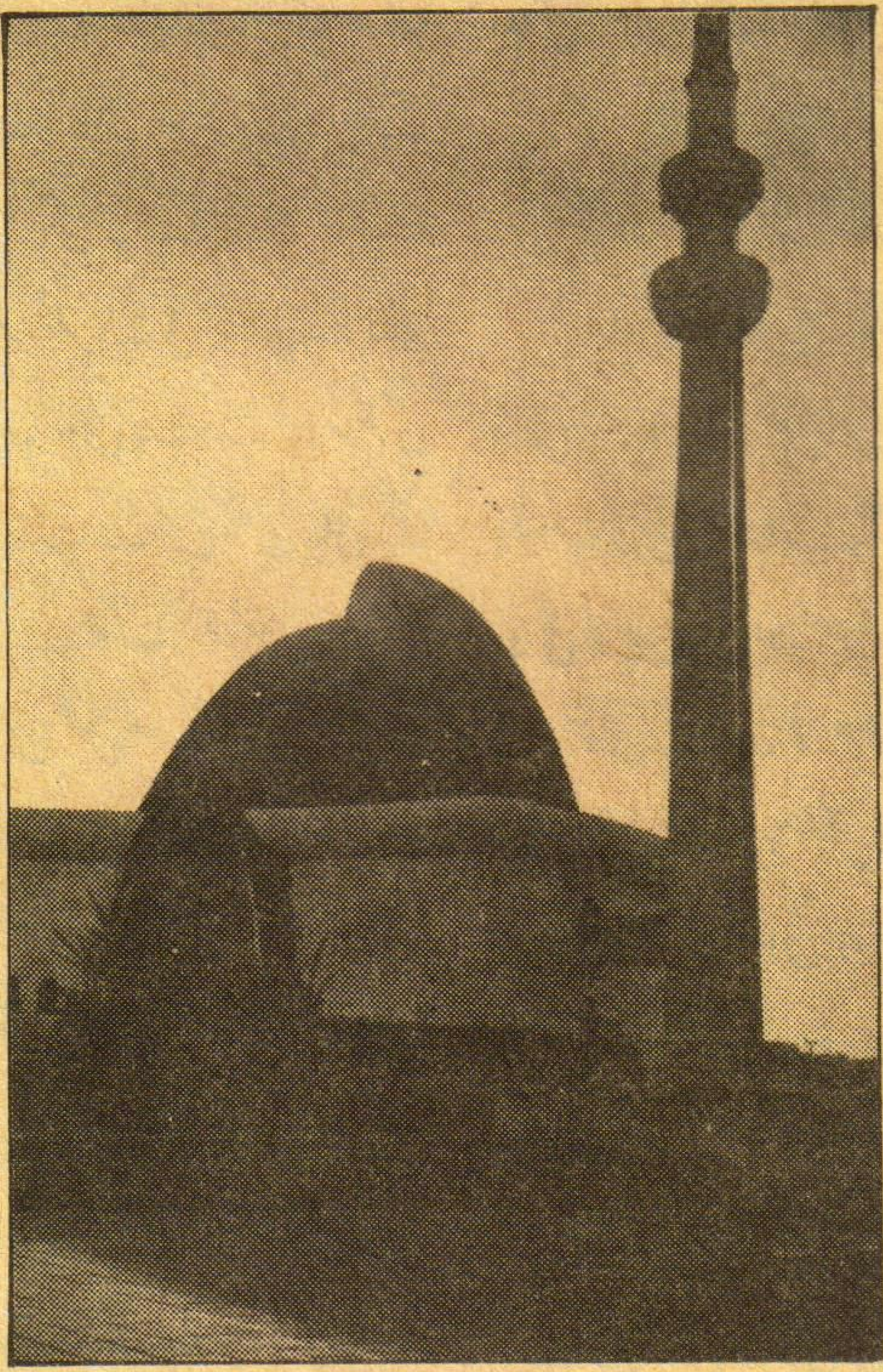
صفحہ ۱۵ سے آگے اس کے بارے میں راویوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک چپٹی ناک والی عورت تھی۔ قیس بن ابی حازم سے روایت ہے کہ انھوں نے اسماء بنت عمیس کو ابو بکر کے ہاں دیکھا جو ایک گوری عورت تھی اور جن کے دونوں ہاتھ موشومہ تھے (طبری)۔ ابی السلیل نے حضرت ابوذر کی بیٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے روایت کی ہے کہ جب ان کی بیٹی اپنے باپ سے ملنے آئی تو چند لوگ ان کے پاس بیٹھے تھے اور السلیل کہتے ہیں کہ ان کی اپنی بیٹی نے اون کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے گال پچکے ہوئے تھے (ابن سعد)۔ حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ میں رسول کے ساتھ بیٹھا کہ فاطمہ آئیں، ہم نے دیکھا کہ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کے لئے دعا کی۔ دعا کے بعد جب میں نے دیکھا تو ان کے چہرے کی بشاشت واپس آگئی تھی۔ (ابن جریر فی التہذیب) قبیصہ بن جابر کہتے ہیں کہ ہم تین لوگ جس میں بنی اسد کی ایک بوڑھی خاتون بھی تھیں ابن مسعود کے ہاں گئے۔ اس خاتون کی پیشانی پر نشانات بنے تھے جس پر انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ابو اسماء الرجبی سے روایت ہے کہ وہ ابوذر غفاری کے ہاں گئے اور دیکھا کہ ان کی ایک بیوی سیاہ فام ہے۔ (احمد و ابن سعد) عروہ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں ایک دن فاطمہ بنت علی بن ابی طالب کے ہاں گیا میں نے ان کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی دیکھی۔ (ابن سعد) یہ اور اس نوعیت کے واقعات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عہد میں مسلم خواتین میں چہرے اور ہتھیلیوں کے چھپانے کا رواج نہ تھا۔

قرن اول کی مسلم سوسائٹی کی طرح اگر آج بھی مسلم خواتین کو وہ تمام آزادیاں دوبارہ لوٹا دی جائیں جو انہیں جلباب کے اندر حاصل تھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ موجودہ بھاگتی دوڑتی زندگی میں بھی وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پاسداری کرتے ہوئے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز نہ پیدا کر سکیں۔ اور اگر فی زمانہ اسلامی احکام حجاب پر عمل کرنا قابل عمل دکھائی دے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم خواتین اسلام سے دور دوسری تہذیب کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں۔ عہد رسول میں مسلم عورت کا پردہ ان کی اس آزادی کی علامت تھی جو اسلام نے انہیں جاہلی معاشرے سے نجات کی شکل میں عطا کیا تھا جب کہ آج مسلم خواتین کے پردے سے مراد یہ ہے کہ اسے عضو معطل بنا کر زندگی کی تمام سرگرمیوں پر روک لگا کر گھروں کی چہار دیواریوں میں بند کر دیا گیا ہو۔ قرن اول کا جلباب عورت کے Empowerment کی علامت تھا جب کہ آج کا مروجہ پردہ اس کی محرومی کا علامیہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرن اول کی جلباب کو دوبارہ حالت میں لے آیا جائے۔ جلباب ہر عہد کی ضرورت کا ساتھ دے سکتا ہے جب کہ ہمارے وضع کردہ ملفوف برقع میں یہ قوت نہیں کہ وہ جاگیردارانہ معاشرے کے علاوہ کسی اور دور کی ضرورت پورا کر سکے۔ ▭

آج بیشتر مسلم حکمراں عالمی نظام کفر کے استحکام میں مصروف ہیں

عالمی خلافت کی ضرورت پر ایک چشم کشا تحریر

اقتصادیات سے لے کر حفظان صحت کے اصول تک زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمان مغربی اقوام کو عملی نمونہ تصور کرتے ہیں۔ اس تصور نے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو مغرب کی طرف نقل وطن کرنے کی ترغیب دی ہے۔ امریکہ مثال کے طور پر دنیا کا ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے اور اس کے بعد نام لیا جاتا ہے برطانیہ اور فرانس کا ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے آرزومند ہیں، لیکن بنگلا دیش اور کویت جیسے اسلامی ممالک ان کے لیے نسبتا غیر اہم ہیں۔ دنیا کے ان کے تصویر کردہ خاکے میں کہیں نہیں سماتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے مسلم دنیا کے کسی ملک کی حیثیت کی تعین کی فرمائش کی جائے تو دوسری قوموں کو متاثر کرنا تو درکنار ان سے یہی معلوم ہوگا کہ وہ مسلم ممالک خود ہی دوسرے ممالک کے زیر اثر ہیں۔ ان حقائق پر غور وخوض محض ایک علمی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ امت اسلامیہ کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اللہ جل شانہ نے امت مسلمہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ اسلام تمام قوموں کے لیے منفرد معیار بن کر ابھرے کیونکہ انسان کے لیے ہدایت الٰہی کا یہ آخری پیغام ہے۔



فی زمانہ دنیا پر سرمایہ دارانہ اقدار کا غلبہ ہے اور یہ غلبہ ناقابل فہم نہیں ہے۔ سرمایہ داری سے وجود میں آنے والے معیارات کی روشنی میں واقعات وحوادث کو پرکھا اور آنکا جارہا ہے۔ طالبان کی طرف سے افغانستان میں اخباری نمائندوں کے داخلے پر پابندی کی داستان کا میڈیا کے ہاتھوں انتخاب اور اس کا اچھالا جانا آزادی غالب تصور کو واضح طور پر مستحکم کرتا ہے۔ طالبان کے اقدام کی مذمت تو سخت سے سخت لہجے میں کی جاتی ہے کیونکہ اسے افغانی عوام کی شخصی آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے اور اسے میڈیا کی آزادی تقریر پر بندش کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ جو بات کبھی نہیں سوچی جاتی وہ یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ اعمال کا احتساب آزادی کے انسان ساز معیاروں کی مدد سے کریں یا کہ ان حقوق اور واجبات کی روشنی میں جو اللہ کی طرف سے اترا ہے۔ ثقافتی غلبے کی دوسری مثال "قیام امن کی کوشش" ہے جس کے لیے یو این منڈیٹ اور امریکی مداخلت متفقہ معیارات ہیں۔ درحقیقت بعض مسلمانوں کو اسرائیلی انتہا پسندی پر اس بناء پر غصہ آیا تھا کہ ان معیارات کو پامال کیا گیا تھا۔ نتن یاہو کو اسرائیلی ریاست کے شانہ بشانہ ایک فلسطینی ریاست کے قیام کے امریکی منصوبے کو روبہ عمل لانے کے لیے کمربستہ سمجھا جارہا ہے۔ یہاں یو این منڈیٹ اور امریکی مداخلت بغیر اس سوال کے تسلیم کی جارہی ہے کہ اسلام کے نزدیک بھی وہ قابل قبول ہیں۔ اس طرح اسلام کو مسلمانوں کے لیے ایک معیار عمل کی حیثیت سے واضح طور پر مسترد کیا جارہا ہے اور اس کی جگہ پر ایک ایسی چیز کو لایا جارہا ہے جسے (انسان ساز) بین لاقوامی قانون کہا جاتا ہے۔

ثقافتی غلبے کی ضرورت

ان مثالوں میں یہ بات صاف ہے کہ سرمایہ داری کا "عقیدہ" اور اس سے ابھرنے والا تصور دونوں ہی قوموں کے داخلی اور خارجی امور میں غالب عنصر کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں اور یہ سب کچھ اپنے آپ نہیں ہوگیا ہے۔ اس کا نشانہ ان لوگوں نے پہلے ہی باندھ رکھا تھا جو سرمایہ داری میں ایمان رکھتے ہیں اور ان ریاستوں نے اسے عملی جامہ پہنایا ہے جو اس نظریے میں یقین رکھتی ہیں اور ان میں سرفہرست امریکہ کا نام آتا ہے۔ اس کا اندازہ امریکی صدر بل کلنٹن کے حالیہ دورہ چین سے ہوتا ہے جہاں انھوں نے چین کی داخلی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے آزادی کے تئیں لوگوں کو بیدار کیا۔ ۲۸ جون کو بیجنگ یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے

انھوں نے چینی حکومت کو سرمایہ دارانہ معیارات اختیار کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا تھا "آج ہم اپنے خیالات و تصورات دوسروں پر مسلط کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہمیں یقین ہے کہ بعض حقوق آفاقی ہوتی ہیں نہ وہ امریکی ہیں نہ یوروپی، نہ فرانسیسی اور نہ ترقی پذیر قوموں کے حقوق بلکہ دنیا کے ہر خطے میں آباد انسانوں کے آفاقی حقوق ہیں جنھیں اب اقوام متحدہ کے اعلان برائے انسانی حقوق میں شامل کردیا گیا ہے۔ انسانی حقوق کو آفاقی کہنے سے ان کا مطلب یہ ہے کہ پوری دنیا کو چاہیے کہ اس اعلان کو ایک معیار کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ اپنے طور پر یہ اعلان امریکی ریاست کی طرف سے چلائی گئی تحریک کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ کئی دہائیوں سے امریکی سرکاری مشینری نے ایسے کتنے ہی اقدامات کیے ہیں جن کا مقصد یہ ضمانت دینا ہے کہ سرمایہ داری ہی اصل معیار حیات ہے۔ ان اقدامات میں صدارتی تقریریں، کانفرنسیں، انسانی حقوق کی رپورٹیں اور سروے شامل ہیں۔ کارٹر کے زمانہ صدارت سے لے کر اب تک امریکہ نے سالانہ عالمی انسانی حقوق سروے دیگر ممالک پر یہ تاثر قائم کرنے کی غرض سے شائع کیے ہیں کہ سرمایہ دارانہ اقدار کو انسانی سلوک و روابط کا معیار بنایا جانا چاہیے۔ امریکہ نے اس کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے کہ اس کی راہ میں کوئی ایسا چیلنج نہ آنے پائے جو اسے موجودہ مستحکم پوزیشن سے ہٹادے۔ اسی لیے وہ دیگر نظریات کی تردید کے لیے سرکاری مشینری کو استعمال کرتا رہتا ہے۔ کئی دہائیوں تک جب کمیونزم کی نمائندگی ریاست کی حیثیت سے ہوا کرتی تھی امریکی حکومت نے اس یقین دہانی کے لیے کئی حربے استعمال کیے کہ اشتراکیت کی طرف سے لوگ متنفر ہوں۔ میڈیا، کانفرنسوں اور کمیٹیوں نے عالمی اکھاڑے میں ایک قابل عمل معیار کی حیثیت سے کمیونزم کا خاتمہ کردیا اور لوگ "سرخ سویرے" کے اطلاع ہونے کے تصور سے کانپنے لگے۔

مسلمان بھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ اگرچہ آج اسلام کی نمائندگی کرنے والی کوئی ریاست موجود نہیں ہے۔ امریکہ خوب جانتا ہے کہ یہ کچھ ہی وقت کی بات ہے۔ نتیجتاً اس نے احتیاطی اقدام کے طور پر اسلامی ثقافت کے خلاف عالمی

رسول اللہ کے اسوہ مبارکہ اور آپ کی قائم کردہ مثال پر آج اسلامی دنیا میں کہیں بھی تو عمل نہیں ہورہا ہے۔ تقریریں اور وفود غیر اسلامی معیار و اصول کو چیلنج کرنے کے بجائے خود انھیں کے نظام عمل کی اتباع کرنے لگ جاتے ہیں۔ ماثر محمد، نواز شریف اور شاہ حسین ڈیموکریسی کی صدا لگانے میں کلنٹن، چراک اور بلیر کے ہم پلہ ہی ہیں۔

کیا لوگ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ مغرب نے انسانی حقوق کے نام پر دوسروں کے ذریعے عراق پر بمباری کرکے اور وہاں کے عوام کا بائیکاٹ کرکے عراقی مسلمانوں کے زندہ رہنے اور غذا و دوا حاصل کرنے کے حقوق پامال نہیں کیے ہیں۔ اس کے وہ قیمتی حقوق کہاں تھے جب اسرائیل جیسی قومیں مسلمانوں کے آراضی پر مستقل قبضہ جمائے رہتی ہیں؟

پیمانے پر حملے شروع کردیے۔ اس کے خیال میں یہ سارے ہتھکنڈے خلافت کی بازیابی کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں ایک معیار کامل کی حیثیت سے سرمایہ داری کا تصور قائم رکھنے میں اس کے مددگار ہوں گے۔

عالمی منظرنامے میں معیار کامل کی حیثیت سے اسلام کی عدم موجودگی

اللہ کا فرمان ہے کہ "ہم نے تم کو صحیح امت بنایا تاکہ تم بنی انسان کے شاہد بن سکو اور رسول اللہ تمہارے شاہد ہیں۔"

مسلمانوں کی دلی خواہش ہے کہ اسلام کو تمام لوگوں کے لیے ایک معیار کامل ہونا چاہیے۔ انھیں اس بات پر رنج ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں مسلمان بھی مغربی اقوام اور ان کی اقدار کے طلسم میں آگئے ہیں۔ انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اسلام کو گلی کوچوں میں اور صحافت کی دنیا میں گھسیٹا جارہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے فورم قائم کرلیے ہیں اور میڈیا مانیٹرنگ کے مراکز اور تنظیمیں بنالیں ہیں تاکہ اس مشکل کا مقابلہ کرسکیں۔ وہ اخبارات، ٹی وی اور ریڈیو میں اسلام پر ہونے والے حملوں اور اہانت آمیز تحریروں کا تعاقب کرتے ہیں، تاہم مخالفت کا طوفان تھما نہیں ہے۔ اسلام آج بھی دھندلکے ہی میں ہے کیونکہ آزادی کا سورج چڑھا ہوا ہے۔

یہ تمام تر صورت حال اس بناء پر قائم ہے کہ دنیا میں اس کو غالب کرنے کی ذمہ داری محض افراد کی ہی نہیں ہے۔ اسلام نے اس کی وضاحت کردی ہے کہ کسی ریاست کو اس کام کو اپنا مقصد بنانا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست اس بات کو یقینی بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتی ہے کہ اسلام لوگوں کے لیے معیار کامل بن جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کئی صدیوں تک لوگوں کے لیے معیار کامل بنا رہا ہے اور اسلامی ریاست اٹھارویں صدی تک نمایاں ترین ریاست تھی۔ اس ریاست نے جو طریقہ ہائے کار اختیار کیے وہ سب اسلامی متون میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

صدر اول کی مثال

جب رسول اللہ نے مدینہ منورہ میں خود کو مستحکم کرلیا تو آپ نے فورا رومی، ایرانی اور مصری لیڈروں کے پاس اپنے قاصد بھیجے اور ان تک یہ حکم کہلوادیا کہ وہ اسلام قبول کرلیں اور اگر ایسا وہ نہیں کرتے تو اسلام کی حکمرانی تسلیم کرلیں۔ اس اعتبار سے بھی ریاست کے سربراہ اعلیٰ کی گفتگو اور تقریر کا مقصد اسلامی "عقیدے" کے نقطہ نظر سے بین الاقوامی امور کی انجام دہی ہونا چاہیئے۔ رسول اللہ کے زمانے میں یہ تاثر سب کے ذہنوں پر نقش تھا کہ اسلامی ریاست ہر واقعے اور حادثے کو اسلامی بصیرت کے تناظر میں دیکھنے کی متمنی رہتی ہے خواہ وہ واقعات کبھی اور کہیں بھی رونما ہوں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی واضح کردیا کہ اسلام کو اس طرح معیار کامل بنایا جائے کہ اغیار کو اس دائرہ کار سے خارج رکھا جائے۔ اس طرح رسول اللہ کی کامیابی سے مراد مادی خوشحالی نہیں جس کا تصور دیگر عقائد کے ماننے والے رکھتے ہیں اور جس تک دیگر ریاستیں رسائی پانے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔

اس لیے آج اسلامی ریاست کو نہ صرف اسلام کی نمائندگی کرنی چاہیے بلکہ اسے سرمایہ داری کی بدعنوانیوں اور تضادات کو بے نقاب کرتے ہوئے ایک معیار اور اصول کی حیثیت سے اسے بے دخل بھی کرنا چاہیے اور تمام انسانوں کو صاف طور پر بتادینا چاہئے کہ امریکہ کے دعوؤں کے برخلاف انسانی حقوق کا نعرہ آفاقیت سے بہت دور ہے۔ یہ وہ حقوق نہیں ہیں جن کا مقصد بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود ہو بلکہ یہ وہ حقوق ہیں جنھیں سرمایہ دار ریاستیں ان انسانوں کے احساسات کو مردہ کرنے کی غرض سے عزیز رکھتی ہیں جن کا استحصال انھیں مقصود ہے۔

اسلامی ریاست لوگوں کو اس طرح جھنجھوڑے کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ تمام دستیاب وسائل کو بروئے کار لانے کے لیے آمادہ ہوجائیں۔ کیا لوگ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ مغرب نے انسانی حقوق کے نام پر دوسروں کے ذریعے عراق پر بمباری کرکے اور وہاں کے عوام کا بائیکاٹ کرکے عراقی مسلمانوں کے زندہ رہنے اور غذا و دوا حاصل کرنے کے حقوق پامال کیے ہیں۔ اس کے وہ قیمتی حقوق کہاں تھے جب اسرائیل جیسی قومیں مسلمانوں کے آراضی پر مستقل قبضہ جمائے رہتی ہیں؟ کیا یہ بھی نظر نہیں آتا کہ لاطینی امریکہ اور افریقہ فاقہ کشی کی حد تک تباہ و برباد کیا جاچکا ہے

اسلام نے اس کی وضاحت کردی ہے کہ کسی ریاست کو اس کام کو اپنا مقصد بنانا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست اس بات کو یقینی بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتی کہ اسلام لوگوں کے لیے معیار کامل بن جائے

اور مغربی بین الاقوامی کمپنیاں دام بڑھانے کی غرض سے غذائی اشیاء یا تو تلف کردیتی ہیں یا دودھ کی فصیل اور مکھن کے پہاڑ کی شکل میں ان کی ذخیرہ اندوزی کررہی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ خالق کائنات نے جن حقوق کی اتباع کا حکم دیا ہے وہ ان حقوق سے کہیں برتر ہیں جن کا اطلاق انسان نے خود اپنے اوپر کرلیا ہے۔

خاتمہ

رسول اللہ کے اسوہ مبارکہ اور آپ کی قائم کردہ مثال پر آج اسلامی دنیا میں کہیں بھی تو عمل نہیں ہورہا ہے۔ تقریریں اور وفود غیر اسلامی معیار و اصول کو چیلنج کرنے کے بجائے خود انھیں کے نظام عمل کی اتباع کرنے لگ جاتے ہیں۔ ماثر محمد، نواز شریف اور شاہ حسین ڈیموکریسی کی صدا لگانے میں کلنٹن، چراک اور بلیر کے ہم پلہ ہی ہیں۔ اسلام کو عالمی سیاست میں ایک معیار کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی اور نہ ہی بدعنوان سرمایہ دارانہ اقدار کی تردید و تکذیب ہی کی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام دنیا کی ایک بڑی آبادی کا مذہب ہونے کے باوجود دنیا کے اکھاڑے میں اپنا کوئی اثر اس طرح نہیں قائم کیا جیسے کہ سرمایہ داری نے کیا۔ فرق واضح ہے۔ اسلام کا فروغ افراد کے ہاتھ میں ہے جب کہ سرمایہ داری کے فروغ کا بیڑہ ریاستیں اٹھائے ہوئے ہیں۔ اسلام کے مطابق امت اسلامیہ اور وہ جس اسلامی عقیدے کی نمائندہ ہے انہیں دونوں کو دنیا میں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہئے۔ سردست امریکہ کے ہاتھوں اس کا استحصال ہورہا ہے اسی لیے اللہ تعالی نے جو رول اور کردار امت کو تفویض کیا ہے اس کی انجام دہی کے لیے ایک اسلامی ریاست کی درکار ہے۔



امیر ترین مسلم ملک برونائی

رنگ و رباب کی محفلوں پر داخلی سیاست کا سایہ

جزیرہ بورینو کے شمالی مغربی ساحل پر واقع برونائی کی مملکت کے فرماں روا سلطان حسن بلاقی ابھی ۱۵/جولائی کو اپنی باونویں سال گرہ کا جشن منا چکے ہیں۔ یہ جشن برونائی کی قومی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن امسال اس کا رنگ کچھ پھیکا سا رہا کیونکہ اس میں دو سال پہلے کی طرح مائیکل جیکسن جیسا کوئی مشہور زمانہ فنکار رقاص ان کا دل بہلانے نہ آسکا۔ کچھ وقت کے لیے ایسا لگا تھا کہ اشیاء کی اقتصادی بحران نے برونائی کی چوکھٹ کو نہیں چھوا ہے لیکن یہ خیال جاگتی آنکھوں کا خواب ہی ثابت ہوا اور یہاں بھی گذشتہ سال کے مقابلے میں تیل کی قیمت میں تقریبا 36% کی گراوٹ آچکی ہے۔ سیاحت کی آمدنی بھی سمٹ کر رہ گئی کیونکہ ایشیائی ممالک سے لوگوں کی آمد بند ہوگئی اور برونائی ڈالر جو اپنے سنگاپوری ہمسر کرنسی کے مقابلے پر جما ہوا تھا۔ بحران کے اثر سے بچ نہ سکا۔ اس صورت حال نے حکومت کو بڑے امتحان میں ڈال دیا۔ وزارتوں کے مالی. بجٹ میں نمایاں کمی آئی اور چونکہ برونائی میں پوری معیشت حکومت کے ہاتھ میں ہے تعمیری پروجکٹ ایک دم معطل ہوکر رہ گئے اور ہزاروں غیر ملکی ملازمین کو اپنے وطن لوٹنا پڑا ہے۔ اس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ برونالی میں موجود چالیس ہزار تھائی لینڈی ملازمین واپس جا چکے ہیں اور یہی حال ملیشیا، انڈونیشیا اور فلپائن سے آئے ہوئے کارکنان کا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا بڑی تعداد میں انخلاء کرایوں، ہوٹلوں، ٹیکسی ڈرائیوروں اور دوکانداروں کی آمدنی کو متاثر کرے گا۔

خود سلطان کا عموما پر سکون دربار ایک غیر معمولی چیلنج سے دوچار ہے۔ جہاں ملکی اقتصادی مسائل کے سر اٹھاتے ہی ان کے محافظوں اور رشتہ داروں میں گھریلو سیاسی جنگ بھی شروع ہوگئی ہے۔ اس جنگ کا تعلق ان کے تین بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے بھائی چوالیس سالہ جعفری سے ہے جو غیر فعال امیدیو ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے سربراہ ہیں، جس کے انتظامی امور ان کے بیس اکیس سال کے بیٹے حکیم کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کارپوریشن میں انتشار کی افواہیں ایک سال پہلے ہی پھیلنی شروع ہوگئی تھیں لیکن جب سرکاری بورینو پلٹن اسی جولائی میں کارپوریشن کو درپیش سخت مشکلات سے عوام کو آگاہ کیا تو خاصی حیرت ہوئی۔ اگرچہ اس کارپوریشن کی اصل سرگرمی تعمیرات ہے لیکن اس کی دلچسپیوں میں ماہی گیری، مواصلات، سیاحت، لکرری ہوٹل وغیرہ بھی شامل ہیں۔ باوجود اس کے گذشتہ سال کارپوریشن کی بدحالی کی افواہوں کو دبا دیا گیا تھا لیکن بدحالی واقعی اپنے قدم جما چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۷ میں حفیری جو دس سال سے زائد عرصے سے

وزیر مالیات چلے آرہے تھے اس عہدے سے اچانک سبکدوش کردئے گئے اور سلطان نے خود یہ پورٹ فولیو سنبھال لیا تھا۔ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کی آڈٹ رپورٹ نے مبینہ طور پر بدعنوانی کے معاملات پکڑے اور پھر جفری اور ان کے ملیشیائی شریک ڈینی وونگ نے جن کاموں کے بھی ٹھیکے لیے تھے وہ سب کے سب روک دئے گئے۔ امیدیو کارپوریشن میں سنگین مالی بدعنوانیوں کے باوجود متعلقہ ذمہ داران پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا اس لیے کہ اس میں شاہی خاندان کے افراد ملوث تھے۔

ابھی جون میں وزیر قانون، بحری عباس کو جو رائل برونائی ایرلائنز کے اٹارنی جنرل بھی ہیں دفعتا برطرف کردیا گیا اور اس کے ساتھ وزارت قانون میں مستقل سکریٹری اور سولی سٹر جنرل عباس سیریدون کو بھی بظاہر چلتا کردیا گیا لیکن ہوا یہ کہ ۱۶ جولائی کو عید میلاد النبی کے موقع پر پریڈ میں وہی تجریت عباس حسن بلاقی کے پہلو میں کھڑے ہوئے تھے اور اس طرح شاید برونائی کے عوام کے سامنے شاید بناوٹی اتحاد کا مظاہرہ کیا گیا۔

جفری کے تعلق سے یہ واضح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ابھی کس عہدے پر قابض ہیں تاہم عوام کی نظروں میں ان کی حیثیت کافی گر گئی ہے۔ دراصل جفری کی شخصیت کے زوال کے بعد ہی امیدیو کارپوریشن بحران کا شکار ہوا ہے۔ انھیں جنسی دل لگی کے الزام میں اٹھانے والے دو عدالتی مقدمات ابھی ختم ہوئے ہیں لیکن جفری کا نام ابھی پوری طرح ان مقدمات سے خارج نہیں ہوا ہے۔ ایک مقدمہ میں جو امریکی ملکہ حسن کی طرف سے دائر کیا گیا تھا جفری اور حسن البلاقی دونوں پر بڑی بڑی تنخواہوں کا وعدہ کرکے عورتوں کو بہکا کر برونائی لانے اور پھر انھیں قید کرکے ذاتی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کا الزام تھا۔ ایک اور مقدمہ میں جفری پر ۱۳۰ ملین ڈالر کے تاوان کا دعوی کیا گیا تھا، کیونکہ وہ ایک جائیداد کے سودے کی شرائط کی تعمیل میں ناکام رہے تھے اور جیسا کہ ان کے حامیوں نے بتایا کہ تنازعہ مدعیان کے ہی ایماء پر ختم ہوا تھا۔ ان کے ایک مقدمے کی سماعت کے دوران جو الزامات عائد کیے گئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ لندن کے ڈورچسٹر ہوٹل میں جو بلاقی کی ملکیت ہے وہاں انھوں نے چالیس طوائفیں رکھ چھوڑی تھیں۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کی وجہ سے شہنشاہیت جس طرح تنقید کا نشانہ بنی ہے ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

بعض افراد کا کہنا ہے کہ ان سب کے پیچھے برونائی کی سیاسی اور اخلاقی روح کے تحفظ کا جذبہ کارفرما ہے۔ جفری کو ایک آزاد خیال مصلح تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے بھائی محمد یعنی وزیر خارجہ قدامت پرست ہیں اور محتاط پسند عوامی شبیہ کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جفری کا حامی گروہ زیادہ مضطرب نظر آرہا ہے۔ جفری کے ترجمان کا کہنا ہے کہ برونائی کی سیاست بنا رخ اختیار کرکے قدامت پسندانہ خطوط پر جارہی ہے اور جو کچھ اس وقت دکھائی دے رہا ہے وہ بنیادی طور پر جفری اور قدامت پسندوں کے درمیان کھلی معرکہ آرائی ہے جو جفری نکال باہر کردینے اور کچل ڈالنے کے درپے ہیں۔ دوسروں کا بیان ہے کہ ایسی کسی سازش کا قیاس حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا کیونکہ اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ محمد جیسا کوئی شخص لوگوں کو جفری کے خلاف بھڑکائے گا بلکہ جفری خود اپنا ہی دشمن ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دونوں کے درمیان چپقلش کی نوعیت خالص اقتصادی ہے۔ امیدیو جفری کے تصرف میں ہے تو QAF گروپ پر محمد کا قبضہ ہے۔ یہ گروپ میڈیا، کاروں کی تجارت فوڈ کمپنیوں وغیرہ پر مشتمل ہے اور ان دونوں کے درمیان تجارتی مسابقت چلتی آئی ہے۔

نہ صرف یہ کہ حسن بلاقی خاندانی اختلافات اور ملک کے اقتصادی بحران جیسے مسائل سلجھانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں بلکہ ایک طرح کی سیاسی بے چینی بھی ملک میں پائی جاتی ہے۔ ۱۹۸۶ سے اب تک ان کی کابینہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن جفری کے رخصت ہوتے ہی وزیروں کی برطرفی نے راجدھانی کو ہلاکر رکھ دیا اور حالت یہ ہے کہ تیرہ وزارتوں کو نو وزراء سنبھالے ہوئے ہیں، جن میں خود بلاقی بھی شامل ہیں جن کے پاس تین تین پورٹ فولیو ہیں۔ برونائی جیسے ملک کے لیے یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں تین وزیروں کو برطرف کیا جاچکا ہے اور آنے والے دنوں میں مزید تبدیلیوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ان تمام حالات نے سلطان بلاقی کو خارجی سے زیادہ داخلی امور پر توجہ دینے پر مجبور کردیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پچھلے مہینے نہ صرف وزارتی تبدیلیاں ہوئیں بلکہ داخلی معیشت کو سہارا دینے کے لیے ان کی حکومت کو ۲۰۰ ملین ڈالر منظور کرنے پڑے اور جیسا کہ ایک تاجر کا مشاہدہ ہے معیشت پر عوام کا اعتماد بحال ہورہا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اگلے برس سلطان کا جشن سالگرہ اتنا پھیکا نہیں رہے گا۔ ▭

جفری اور حسن البلاقی دونوں پر بڑی بڑی تنخواہوں کا وعدہ کرکے عورتوں کو بہکا کر برونائی لانے اور پھر انھیں قید کرکے ذاتی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کا الزام تھا۔

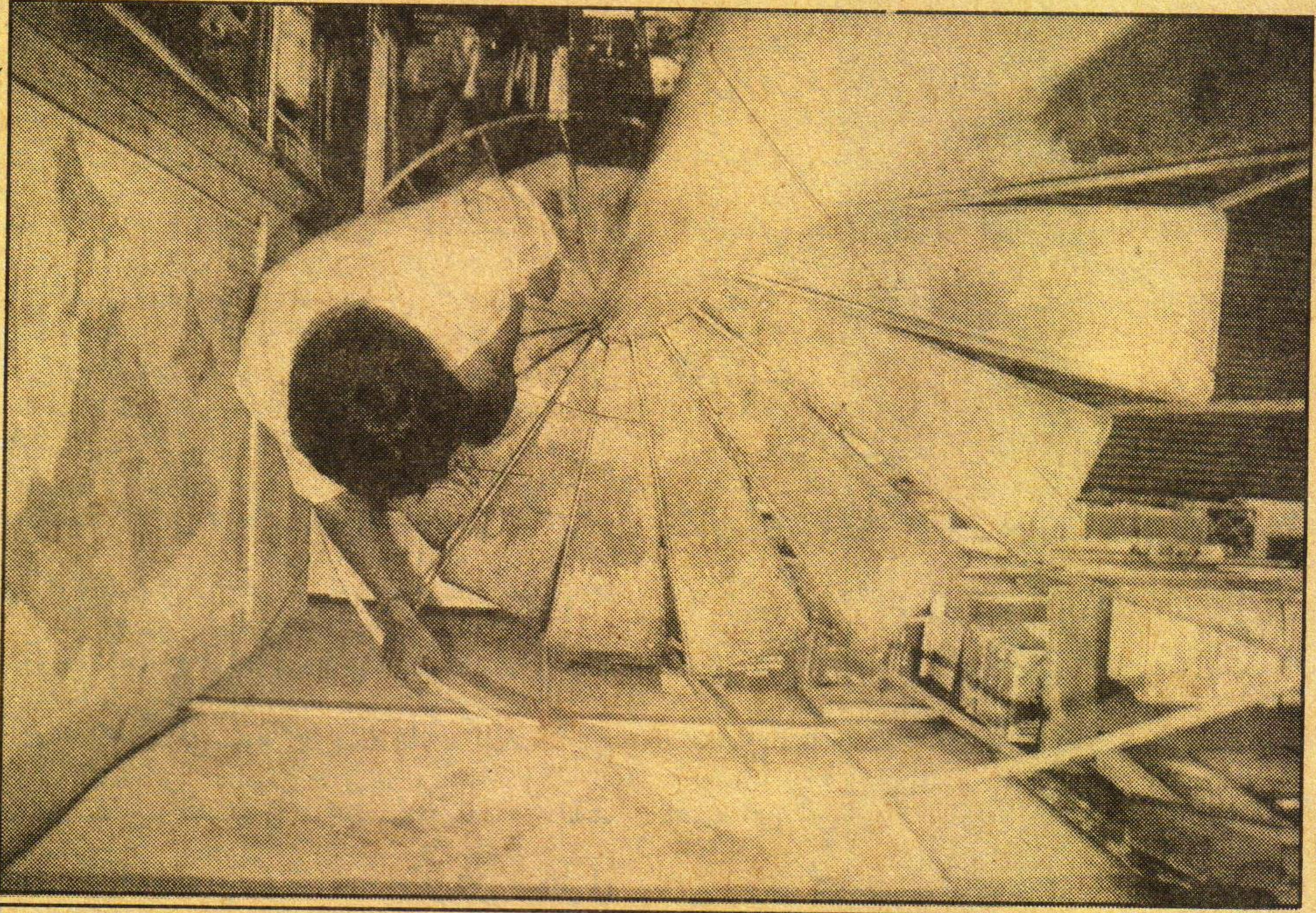
ایک مقدمے کی سماعت کے دوران جو الزامات عائد کیے گئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ لندن کے ڈورچسٹر ہوٹل میں جو بلاقی کی ملکیت ہے وہاں انھوں نے چالیس طوائفیں رکھ چھوڑی تھیں۔

ہندوستان کے فکر مند تاجروں کو جیوتش کا سہارا

خوش عقیدگی نے کسے ڈبویا؟ کسے ابھارا؟

دہلی کا ایک گارمنٹ ایکسپورٹر اپنی دن بدن گرتی ہوئی تجارت کے اسباب پر غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ کہیں اس کی اس بدحالی کا تعلق اس کی کمپنی کی عمارت کے ڈھانچے سے تو نہیں۔ یہ سوچتے ہی شک اس کے ذہن میں جڑ پکڑ گیا۔ آخر وہ وستو ودیا کے ماہر جگل کشور سے جاکر ملا۔ "وستو ودیا" کی بنیاد اس قدیم ہندوستانی عقیدے پر ہے کہ افراد کی قسمتوں کی اچھائی یا برائی کا تعلق اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کے کام کی جگہ کا انتظامی ڈھانچہ کیسا ہے۔ جگل کشور نے اپنے موکل کی پانچ منزلہ فیکٹری کا معائنہ کرتے ہوئے منیجروں کے بیٹھنے کے انتظام سے لے کر دروازوں کی پوزیشن اور ان کی سمت تک کی ناپ جوکھ کی۔ پھر انھوں نے یہ تین مشورے دیے کہ فیکٹری میں داخل ہونے کا لوہے کا دروازہ چند میٹر کی دوری پر لگایا جائے، اس میں کام کرنے والے درزی پورب کی طرف منہ کر کے بیٹھیں۔ چھت پر بنا ہوا کنکریٹ کا آئل ٹینک اتار دیا جائے اور دوسرا ٹینک اس سے چند گز کی دوری پر مغرب کے رخ پر بنایا جائے۔ تاجر کو اندازہ تھا کہ ان تبدیلیوں کو کروانے میں خاصا بڑا خرچ ہے لیکن اس نے ہر کام کروانے کی حامی بھر لی، آخر اسے اپنی قسمت جو سنوارنی تھی۔

ہندوستان کی بگڑی ہوئی تاجرانہ فضا میں ہزاروں تاجر چار ہزار سال پرانے علم کی طرف پھر سے لوٹ رہے ہیں جو چین میں فینگ شوئی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس علم کے ماہرین کے اشارے پر ذرا سی دیر میں قیمتی مشینری بدل دی جاتی ہے تو کہیں گھماؤ دار زینے توڑ کر اس کی جگہ دوسری طرز کے زینے بنائے جاتے ہیں اور اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان کی تعداد طاق رہے۔ وستو ودیا کا جادو ایسا سر چڑھ کر بول رہا ہے کہ اب تعمیراتی کمپنیاں اپنے اشتہاروں میں واضح الفاظ میں اس کا ذکر کرتی ہیں کہ ان کے بنائے گئے نقشے اور ڈیزائن وستو ودیا کے اصولوں کے مطابق ہوتے ہیں اور زندگی کے معاملات درست کرتے دعویدار اشتہاروں کی بھرمار اخبارات میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ شہر کی ہر گلی میں وستو جیوتشی مل جائیں گے۔ ہندو اساطیر کے مطابق آسمانوں میں راکھششوں سے لڑتے ہوئے ہندو دیوتاؤں کی آنکھ سے نکلا ہوا ایک آنسو زمین پر گر کر ڈنڈوت کرتے ہوئے آدمی کی شکل اختیار کر گیا اور یہی شکل ہندو فن تعمیر میں ایک نمونے کے طور پر بھی اپنا لی گئی۔ اصل تصور کے پیچھے جو جذبہ ہے اس میں صدیوں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور اسی طرح چلتا آرہا ہے۔



☝ توہم پرستوں کے نزدیک یہ دائرہ نما زینہ منحوس ثابت ہو سکتا ہے

وستو کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ دولت کا دیوتا شمال میں، سورج دیوتا مشرق میں، ہوا کا دیوتا مغرب میں اور موت کا دیوتا جنوب میں رہتا ہے اور یہی دیوتا آگ، پانی، ہوا اور موت کے بھی نمائندے ہیں چنانچہ وستو کا مقصد ان قدرتی عناصر کو

انسان کے فائدے کے لیے اپنے قابو میں لاتا ہے۔ آج اس عقیدے کا محور تین اصول ہیں۔ یعنی یہ کہ مشرق اور شمال سب سے اچھی سمتیں ہیں۔ مغرب عموماً قابل قبول ہے اور جنوب تو پوری طرح خطرناک ہے جہاں موت کا دیوتا جھپٹ پڑنے کے انتظار میں تاک لگائے رہتا ہے۔ آج کے دور میں تجارت پر اگر اس علم کا اطلاق کیا جائے تو اس میں سخت اوامرو نواہی کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ:

- ایسی زمین پر عمارت بنائی جائے جس کا ڈھال شمال یا مشرق میں ہو۔
- فیکٹری میں بھٹی جنوب مشرق میں لگائی جائے اور پوجا کا کمرہ جنوب مشرق میں بنایا جائے۔
- اگر آپ کمپنی کے منیجر ہوں تو اپنے دفتر یا فیکٹری کے جنوب مغربی حصے میں بیٹھیں اور اپنا منہ شمال کی طرف رکھیں۔
- بیچنے والا سامان عمارت کے اس شمال مغربی حصے میں اسٹور کیا جائے جس میں وافر ہوا جاسکے اور اس کا اہتمام رکھا جائے کہ وہ سامان زیادہ دن تک وہاں پڑا نہ رہے۔
- جنوب مغرب کے رخ پر لگا ہوا داخلی دروازہ مالی نقصان کا سبب بنتا ہے۔
- شمال مشرق کے رخ پر بنے ہوئے کپ بورڈ کے پنسل شمال کی طرف کھلیں تاکہ دولت کے دیوتا کے علاقے میں موجود نقدی کو وہ اپنی طرف کھینچ سکے۔

اس کے علاوہ دیگر اصول بھی ہیں جس کی رو سے۔ جمعہ یا اتوار کو مغرب کی طرف سفر نہ کیا جائے تو۔ جمعرات کو جنوب کی طرف۔ جنوب کی طرف سرہانا کر کے سونے سے صحت خراب ہوتی ہے یا یہ کہ آئینہ ہمیشہ گھر کی مشرقی دیوار پر لگانا چاہیے۔ اس طرح کے احکامات کو لوگ اہمیت دیتے ہیں اور ان پر عمل بھی کرتے ہیں خواہ کتنا بھی خرچ آجائے۔ مثلاً ایک کمپنی Makchless Engineers نے جو اسٹین لیس اسٹیل وائر بناتی ہے اپنی فیکٹری کی پانچ ایکڑ کی آراضی پر کھدائی کروا کے سینکڑوں ٹرک مٹی نکلوا ڈالی تاکہ اسے نئی شکل دی جاسکے۔ اسی طرح ایک اور کمپنی نے جس کا نام ریٹا مشیز انڈیا ہے اپنی کنویر بیلٹ کو اینٹی کلاک وائز سے کلاک وائز

ہندو اساطیر کے مطابق آسمانوں میں راکھشوں سے لڑتے ہوئے ہندو دیوتاؤں کی آنکھ سے نکلا ہوا ایک آنسو زمین پر گر کر دنڈوت کرتے ہوئے آدمی کی شکل اختیار کر گیا اور یہی شکل ہندو فن تعمیر میں ایک نمونے کے طور پر بھی اپنائی گئی۔ اصل تصور کے پیچھے جو جذبہ ہے اس میں صدیوں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور اسی طرح چلتا آرہا ہے۔

سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کا قتل اسی لیے ہوا تھا کہ وہ اپنی رہائش گاہ کا جنوب مغربی دروازہ آنے جانے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ ۱۹۸۴ء میں بھوپال گیس سانحہ جس میں ۵۰۰۰ افراد ہلاک ہوئے اس وجہ سے پیش آیا کہ یونین کاربلنڈ کمپنی جس پلاٹ پر واقع ہے وہ ٹیڑھا میڑھا سا ہے۔

حالت میں لانے کے لیے بڑی رقم خرچ کر ڈالی اور دہلی کی ایک فرم ایم۔ ایس بھرانا نے جیوتشی کشور کی اس تنبیہ پر کہ زمین کے اندر بنائے گئے غار میں بیٹھ کر چلایا جانے والا بزنس تباہ ہو کر رہے گا اپنے تہ خانہ کو چھوڑ دیا۔

تاہم ایسے لوگ بھی ہیں جو وستو ودیا کے جال میں پھنسنے پر آمادہ نہیں اور ان کے ذہن میں اس سے متعلق شبہات پل رہے ہیں۔ روئٹر کے ایک سابق نامہ نگار راجندر باجپئی کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک وستو جیوتشی سے غیر مقیم ہندوستانیوں سرمایہ کاری سے متعلق ایک میگزین کا دفتر قائم کرنے کے لیے صلاح مانگی تھی۔ اس صلاح کا انھیں کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ نیویارک میں مقیم ایک ہندوستانی شریک کارنے پیسہ دینے سے انکار کر دیا اور انھیں خاصا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ باجپئی کے اس شک میں دیگر افراد بھی شریک ہیں جو وستو کے علم کو محض ڈھکوسلہ قرار دیتے ہیں۔ ایک آرکیٹکٹ کا کہنا ہے کہ ڈیزائنر یا انجینئر کی آنکھ سے اوجھل مہربان یا غضبناک دیوتا کسی عمارت کو کیسے متاثر کر سکتے ہیں۔

کچھ بھی ہو وستو جیوتش کی مقبولیت اپنی جگہ ہے یہاں تک کہ آج کی زندگی میں اس نے آرائشی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ دہلی کے ایک پراپرٹی بروکر نے دروازے پر ایک آئینہ لگا کر مغرب میں لگے اپنے اپارٹمنٹ کے بدشگون دروازے کی سمت کو الٹ دیا ہے۔ اس طرح جب وہ گھر میں آتا ہے تو خود کو بدقسمت مغرب کے بجائے خوش شگون مشرق کی طرف سے داخل ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اپنی تجارت کو پھر سے چمکانے کے لیے ایک ہالی ڈے ریسورٹ کمپنی کی مالک اندو ڈالمیا نے اپنی کمپنی کے ریسپشن روم کی ایک دیوار کو پوری طرح آئینوں سے سجا رکھا ہے۔

بدشگون اشیاء کو ہندوستان میں دو المناک حادثوں کا سبب بتایا جاتا ہے۔ سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کا قتل اسی لیے ہوا تھا کہ وہ اپنی رہائش گاہ کا جنوب مغربی دروازہ آنے جانے کے لیے استعمال کرتی تھیں جیسا کہ وستو ودیا کے ماہر ایم وی آر ریڈی کا بیان ہے۔ دوسرے ماہر مسٹر کشور کے مطابق ۱۹۸۴ء میں بھوپال گیس سانحہ جس میں ۵۰۰۰ افراد ہلاک ہوئے اس وجہ سے پیش آیا کہ یونین کاربلنڈ کمپنی جس پلاٹ پر واقع ہے وہ ٹیڑھا میڑھا سا ہے۔

سوال

میرے شوہر ایک اچھی کمپنی میں معقول تنخواہ پر ملازم ہیں۔ ہمارے دو چھوٹے بچے ہیں۔ ابھی اسکول جانے کے مرحلے میں نہیں ہیں۔ گھر پر میری ساس اور دو نندیں ہیں۔ میرے شوہر کے والد نہیں ہیں۔ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میرے اور شوہر کے معاملات میں دیگر افراد کی مداخلت کچھ زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ یہ مجھے ناگوار گذرتا ہے۔ شوہر کو جب اس طرف متوجہ کرنا چاہتی ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ اگر کہیں الگ رہنے لگے تو پھر ماں اور بہن کی خبرگیری کون کرے گا۔ یہ سن کر میں خاموش رہ جاتی ہوں۔ اس مسئلے سے میں بے خبر یا لاتعلق نہیں ہوں کہ ابھی میری نندوں کی بھی شادی ہونی ہے اور اس میں ہماری مدد درکار ہے۔

حمیدہ بیگم (بہرائچ ۔ یوپی)

جواب

شوہر اور بیوی کے معاملات میں کسی کو مداخلت تو نہیں کرنی چاہیے لیکن ہمارے معاشرے کا جو نظام ہے اس میں بعض حالت میں ضرورتاً اور زیادہ تر رواجاً شوہر بیوی، چھوٹے بڑے بھائی بہن ایک ساتھ جوائنٹ فیملی کی شکل میں رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک کو دوسرے سے اخلاقی مدد ملتی رہتی ہے اور سماجی سطح پر ایک استحکام اور مضبوطی کا احساس ہوتا ہے۔ دوسری طرف بعض ایسے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا تعلق معاشی حقائق سے ہوتا ہے ۔ اس طرح مشترک خاندانوں کے باقی رہنے کا انحصار معاشی حالات پر ہے اور آپ کے معاملے میں یہی ہوا ہے جیسا کہ آپ نے ذکر کیا کہ آپ کے سسر کا انتقال ہو چکا ہے اور گھر کی کفالت کی ذمہ داری آپ کے شوہر پر ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ معاشی حالات کے پیش نظر کوئی عورت اپنے میکے والوں کے ساتھ رہے یا کوئی مرد اپنی سسرال والوں کے ساتھ رہے، اس کے کچھ اچھے نتائج نہیں برآمد ہوتے۔ یہاں پر ایک عنصر جذباتی لگاؤ کا بھی آجاتا ہے کہ جب آپ کے شوہر اسی شہر میں ملازم ہیں اور باقی لوگ بھی یہیں رہتے ہیں تو آپ اور شوہر ماں اور بہنوں سے الگ رہائش اختیار کریں، یہ ذرا سماجی سطح پر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ خیر سے آپ کے شوہر کی معقول آمدنی ہے اور یہ بھی اچھی بات ہے کہ آپ کے شوہر پر ان کی والدہ اور بہنوں کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کا احساس بھی آپ رکھتی ہیں۔ یہاں پر مسئلہ بس ایڈجسٹ منٹ کا ہے۔ اگر آپ ماں سے الگ ہو کر کہیں دوسری جگہ مکان بنواتے یا کرایے پر لیتے ہیں اور گرہستی الگ کر لیتے ہیں تو اس سے آپ کی ساس کو نفسیاتی طور پر صدمہ پہنچے گا۔ بہنیں بھی خود کو بے یار و مددگار سمجھیں گی۔ شوہر کو چاہیے کہ کسی وقت اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ کر سنجیدگی سے اس پر بات کریں کہ وہ گھر چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بس اپنے معمولات کو مدنظر رکھتے ہوئے گھر کا ایک حصہ اپنے لیے مخصوص کر رہے ہیں جس میں وہ اور آپ رہیں گے اور جو ضروریات ماں اور بہنوں کی ہے ان کی کفالت کرتے رہیں گے۔ ہماری سمجھ سے شوہر کے عزیزوں کی مداخلت کو مزید نہ بڑھنے دینے کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مداخلت ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں ہے۔ بہنوں کی شادی ہو جائے گی وہ اپنے گھر بار کی ہو جائیں گی۔ بچے جب ذرا بڑے ہو جائیں گے تو دادی ان سے بہلی رہیں گی۔ آپ سے الجھنے کی فرصت کسے رہے گی۔

سوال

میں ۲۷ سال کی لڑکی ہوں اور تمام لڑکیوں کی طرح مجھ میں بھی شادی کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ لیکن ایک خوف بار بار میرے ذہن پر دستک دیتا ہے کہ کہیں بدمعاملہ شوہر سے میرا سابقہ نہ پڑ جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے والد نے میری ماں پر بہت ظلم و زیادتی کا برتاؤ کیا ہے اور کبھی بھی انھیں اپنے کیے پر ندامت نہ ہوئی۔ وہیں سے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ میرا شوہر بھی ایسا ہی نکلے گا جیسا کہ میرا باپ، اور خود کو میں اپنی ماں کی جگہ تصور کرنے لگتی ہوں۔

ریحانہ جبین (ناسک)

جواب

آپ نے جس بات کا ذکر کیا ہے اس جیسے واقعات ہمارے معاشرے میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ جاہل والدین عموماً اور بعض دفعہ جدید مفہوم میں مہذب والدین بھی، بچوں کے سامنے لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے ہیں یہاں تک کہ نوبت مارپیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک واقعے کا آپ کے ذہن پر جو اثر پڑا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ والدین کے طرز عمل پر، بچوں کی اخلاقی اور ذہنی نشوونما کا کس قدر انحصار ہے۔ اگر یہ ظالم اور بے رحم باپ لمحے بھر کو سوچ لیتا کہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کی بدسلوکی کا نتیجہ بیٹی کے مستقبل کی تاریکی کی شکل میں سامنے آنے والا ہے تو شاید وہ بیوی پر زیادتی سے باز آجاتا۔

> **میں اس صدمے میں مبتلا ہوں کہ والد کی طرح کہیں بدمعاملہ شوہر سے میرا سابقہ نہ پڑجائے**

اس میں محض جہالت اور لاعلمی کا ہی ہاتھ نہیں بلکہ خودغرضی اور خباثت کو بھی دخل ہے۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایسی بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ جاہل لوگ اپنے بچوں کے سامنے بیہودگی کی بات نہیں کرتے اور کسی ایسے عمل سے بچتے ہیں جس کی نقل بچے کرنے لگیں یا جن سے ان کی شخصیت کی نشوونما پر اثر پڑے۔ تاہم اس خرابی کی ایک بڑی وجہ دین سے دوری ہے۔ اگر آپ کے والد کو دین داروں کی صحبت ملی ہوتی تو اس کا امکان تھا کہ آپ کی ماں کے ساتھ جو سلوک انھوں نے کیا اس میں تبدیلی آجاتی۔

ہمیں قوی امید ہے کہ والد کے سلوک کا آپ کی نفسیات پر اتنا گہرا اثر نہیں پڑے گا کہ آپ زندگی سے مایوس ہو جائیں اور جس صدمے میں مبتلا ہوئی ہیں اس سے نکلنے کے تمام راستے بند لگنے لگیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو آپ کو یہ معلوم ہونی چاہیے کہ انسان اپنی طبیعت اور پسند کے اعتبار سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی۔ سخت مزاج بھی اور نرم دل بھی اور ایسے بھی جو وقت ضرورت سختی اور نرمی برتنے کے قائل ہوتے ہیں۔ یہ ایک معتدل کیفیت ہوتی ہے اور ہر اعتبار سے پسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح والدین میں جو اگرچہ زیادہ تر اپنی اولاد کی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں لیکن ایسے بھی ہیں جن پر بدی کا عنصر اس قدر غالب آجاتا ہے کہ اس کا نشانہ براہ راست یا بالواسطہ خود ان کی اولاد ہی بننے لگتی ہے۔ آپ اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو ہماری اس بات کی تصدیق ہو جائے گی کہ ایسے بھی نوجوان ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت عطا کی ہے اور وہ صوم و صلوۃ کے پابند ہیں، جب کہ ان کے برعکس بہت سے عمر رسیدہ افراد ہیں جو گمراہی میں پڑے ہوئے اور نماز روزے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان نیک اور ہدایت یافتہ نوجوانوں کو اپنی سماجی اور خانگی ذمہ داریوں کا احساس رہتا ہے۔ اس لئے آپ کا اپنی طرف سے یہ

مفروضہ قائم کرلینا کہ سارے نوجوان آپ کے والد کے نقش قدم پر چلیں گے درست نہیں ہے۔ دنیا اور زندگی اضداد کا مجموعہ ہے یعنی اس میں اچھی چیزیں بھی ہیں اور بری بھی، نیکی بھی ہے اور گمراہی بھی، علم بھی ہے اور جہالت بھی، اجالا بھی ہے اور اندھیرا بھی، امید بھی ہے اور ناامیدی بھی، مسکراہٹ بھی ہے اور آنسو بھی، اس لئے آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ تمام مرد ایک ہی ڈھرے پر جائیں گے۔ اس لئے اس ڈر سے کہ آپ کا ہونے والا شوہر کہیں آپ کے والد ہی جیسا سلوک نہ کرے شادی کے خیال کو ترک کردینا ہے، آپ کے لئے مناسب نہیں ہے اور پھر قاعدہ یہ ہے کہ شادی کے امیدوار مرد سے اس کے حالات، عادات، اخلاق، دینداری وغیرہ سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ ان کی روشنی میں اس کی تجویز پر غور کیا جاتا ہے اور چونکہ عموماً ایک سے زائد رشتے زیر غور رہتے ہیں اس لیے تمام پیغامات کا ایک دوسرے سے موازنہ کرکے کسی فیصلے تک پہنچا جاتا ہے۔ کوئی رشتہ ایک خصوصیت کی بناء پر قابل توجہ ہوتا ہے تو کوئی دوسری خصوصیت کی بناء پر۔ مثلاً اگر دینداری اور اخلاق کا پلہ بھاری ہے تو دیگر اوصاف میں کچھ کمی ہے تو اس طرح کے رشتے کی مقبولیت کی زیادہ گنجائش رہتی ہے۔ اس لیے یہ سمجھ کر کہ والد کی مثال دس صالح افراد میں سے ایک گمراہ کی تھی اپنے لئے رشتے کے انتخاب میں کسی ذمے دار اور خداترس رشتے دار کی مدد حاصل کریں اور جو پیغام آپ کے لیے آئے اس میں آپ لڑکے کی اخلاقی اور دینی حالت کے بارے میں خاص طور سے چھان بین کروائیں۔

اس معاملے کے ایک اور پہلو پر بھی آپ کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی والدہ اپنی ازدواجی زندگی میں انتشار کی وجہ سے پہلے ہی پریشان ہوں گی۔ اب اس کی وجہ سے آپ کے زندگی بھر کنوارے رہ جانے کی فکر میں اور بھی گھل جائیں گی اس لئے جو خرابی ایک بار آچکی ہے کوشش کیجئے کہ اس سے کم سے کم زندگیاں متاثر ہوں۔ جیسا کہ آپ کے بیان سے ظاہر ہے، والدہ کے علاوہ کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا اور ہے نہیں۔ خدا نخواستہ کل ان کی آنکھ بند ہوجائے تو آپ بالکل بے سہارا ہوجائیں گی اس لئے مناسب یہی ہے کہ اپنے گھر کو آپ نئے سرے سے ترتیب دیں۔ آپ کے والدین نے تو کسی طرح گذر بسر کرلی، اب آپ کے سامنے پوری عمر پڑی ہے اس لئے آپ اپنے لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کریں جو دین دار ہو، اچھے اخلاق والا ہو اور اچھے لوگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہو۔ اگر ان باتوں کے ساتھ اس کی آمدنی بس واجبی ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسا کوئی بھی شخص آپ کے لئے بہتر شریک حیات ثابت ہوسکتا ہے۔

سوال

میں ایک بیوی ہوں۔ میرا بیٹا اب اٹھارہ سال کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عمر کا بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ میں چونکہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی ہوں اس پر نظر نہیں رکھ سکتی کہ باہر وہ کیا کرتا ہے۔ کچھ دنوں سے محسوس کررہی ہوں کہ اس کے طور طریقوں میں بے راہ روی ظاہر ہورہی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ اس سے بات چیت کا موقع نکال کر نصیحت کروں لیکن اس میں بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ اس خیال سے کہ خرافات میں نہ پڑا رہے میں نے اسے ایک اسپورٹس کلب جوائن کرادیا۔ اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ میں اسے کسی دوسرے شہر میں پڑھنے کے لیے بھیج دوں تو یہاں جو اس کے غلط ملنے جلنے والوں کا حلقہ ہے اس سے دوری ہوجائے گی۔ میں نے وہی کیا لیکن تین سال کے بعد جب وہ واپس آیا تو کیا دیکھتی ہوں کہ اس کی حالت تو پہلے سے بھی بدتر ہے۔ اس پر اور دل خون ہوگیا لیکن اولاد کی محبت سب کچھ کراتی ہے۔ عزیز رشتہ داروں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھی تو ان کی عقل میں یہ آیا کہ اس لڑکے کی شادی کردی جائے تو اس کا نتیجہ بہتر ہوگا۔ اس مشورے پر عمل کرنے سے میں جھجک رہی ہوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس طرح میں ایک لڑکی پر ظلم کروں گی جب کہ خود میرے بیٹے کا یہ حال ہے۔

مریم بی (بھوپال)

جواب

شکر ہے کہ خود غرضی نے آپ کو اندھا نہیں کردیا ہے۔ اس زمانے میں ایسے گھرانے کثرت سے مل جائیں گے جن میں نوجوان نسل کی بگڑتی ہوئی اخلاقی حالت مستقل مسئلہ بنی ہوئی ہے اور جیسے جیسے ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی عمر آگے بڑھتی ہے یہ مسئلہ سنگین تر ہوتا جاتا ہے۔ دراصل اس مشکل کا تعلق کسی ایک نوجوان لڑکی یا لڑکے سے نہیں ہے بلکہ اس سے ہے کہ انھیں اپنے آس پاس کس طرح کا ماحول میسر ہے اور اس ماحول کی تیاری میں کس کی ذمہ داری ہے۔ اس کا جواب ظاہر ہے یہی ملے گا کہ گھر میں اچھے ماحول کی فراہمی کی ذمہ داری والدین پر ہے۔ یہیں سے ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچے اور نوجوان جب باہر نکلتے ہیں تو وہاں انھیں جو ماحول ملتا ہے اسے صحت مند بنائے رکھنے کی ذمہ داری کن لوگوں پر ہے۔ تو گھر کے ہی نمونے پر یہ قیاس کی جاسکتا ہے کہ باہر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے ان لوگوں پر جو والدین اور سرپرستوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم گھر اور باہر کے ماحول کو دو اکائیاں تصور کرسکتے ہیں اور ان دونوں اکائیوں میں باہمی ربط اور تعاون ہی ایک صالح معاشرے کی بنیاد بنتا ہے۔ گھر میں صرف والدین اگر اپنی اس ذمہ داری کو نبھا رہے ہیں اور باہر جن لوگوں سے اس کی توقع ہے وہ اگر اس سے غافل ہوجائیں تو ہم نوجوانوں کی صحیح نشوونما کی امید نہیں رکھ سکتے۔ اس طرح اگر بچے اور نوجوان اسکولوں سے اچھی باتیں اور عادتیں سیکھ کر آتے ہیں لیکن گھر میں ملنے والا ماحول اس سے مختلف ہو تو بھی ہم ان کے لیے کسی بہتری کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ آج کل ہو یہی رہا ہے کہ دونوں اکائیوں کے درمیان مطلوب رشتہ ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے کی دلچسپیوں کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی کی ہو۔ اسے نصیحت کرنے کے بجائے اس سے اگر آپ یہ کہتیں کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ملنے جلنے والوں کو گھر پر بلالیا کرے اور ان کے ساتھ وقت گزارے تو آپ کو مشاہدے کا موقع ملتا۔ آپ نے اسے تعلیم کی غرض سے دوسرے شہر اس وقت بھیجا جب اسے اپنے پاس رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہوسٹل کی زندگی انہی بچوں کے حق میں مفید رہتی ہے جو دس سال کے بعد ہی وہاں بھیج دئے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ ہوسٹل انتظامی اعتبار سے اتنے اچھے ہوں کہ قریب قریب گھر جیسی دیکھ بھال ان کی ہوجائے۔ یہ لڑکا چونکہ پہلے سے بگڑا ہوا تھا اس لیے وہاں جاکر پچھلی صحبت کے لوگ تلاش کرلیے۔ جہاں تک سوال ہے اس کی شادی کرکے راہ راست پر لانے کا تو اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے کیونکہ ابھی تو اس میں ذمہ داری کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہے۔ پھر کس بوتے پر آپ شادی کی بات سوچ رہی ہیں۔ ▭

موت کے بعد میت کو بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ عدالت میں اس کے لئے جھوٹی گواہی دے دے اور اس کے بدلہ کچھ رقم لے لے۔ دوسرا شخص آمادہ ہو گیا اور پیشگی رقم لے لی لیکن اس معاہدہ کے بعد اس دوسرے شخص کا "مسلم ضمیر" بیدار ہو گیا۔ اب یہ شخص پریشان ہوا کہ اس رقم کا کیا کرے؟ حلال سمجھ کر خود استعمال کرے یا اس کو واپس کر دے ں کے حق میں اسے جھوٹی گواہی دینی تھی؟

جواب ں سے ظاہر ہوتا ہیکہ شہادت زور (جھوٹی گواہی) پر آمادہ شخص نے اللہ کی خشیت اسکے عذاب وعقاب کے خوف سے جھوٹی گواہی نہیں دی اور وہ رقم جو شہادت ادگی کے بدلے اسے ملی تھی اب تک اسکے پاس محفوظ ہے۔

میرا خیال ہے کہ جھوٹی گواہی کا مطالبہ کرنے والا شخص سزا پانے کے قابل ہے ں کی سزا یہی ہوگی کہ اسے اس کے روپۓ واپس نہ کیے جائیں بلکہ فقراء اور مستحقین میں ٹ دیے جائیں یا کسی اور بھلائی کے کام میں صرف کر دیے جائیں۔ اس شخص کے لئے جو جھوٹی گواہی دینے پر آمادہ ہو گیا تھا اس رقم کا استعمال اپنے حق میں بالکل درست نہیں۔ اس کا استعمال صرف رفاہی کاموں میں کیا جا سکتا ہے۔

سوال تسبیح و تحمید کے لئے تسبیح کے دانوں کے استعمال کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ تو ظاہر ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ اگر دانوں پر تسبیح کرنے والا یہ سوچ بیٹھے کہ اس میں انگلیوں پر تسبیح کرنے سے زیادہ اجر و ثواب ہے تو یہ عین بدعت ہے۔ کیونکہ اس عمل کے اجر و ثواب میں دانوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہاں اگر دانوں پر تسبیح و تکبیر سے مقصود عدد ماثور کی ٹھیک ٹھیک گنتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ یہ دانے اس مقصد کے لئے بہتر وسیلہ ہیں۔

سوال میرے والد کا ابھی جلد ہی انتقال ہوا ہے۔ ان کی تدفین سے پہلے مجھے میرے ایک رشتہ دار نے آخری سلام کے لئے کہا لیکن چونکہ مرحوم کی تجہیز و تکفین ہو چکی تھی اس لئے میں نے بوسہ لیا نہ سلام کیا۔ مرحوم کی زندگی میں میں ان کا اطاعت شعار تھا۔ انہوں نے میرے لئے اور میرے بھائیوں کے لئے فوز و فلاح کی دعا بھی کی تھی۔ اب مجھے یہ تشویش ہونے لگی کہ کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی؟ شریعت اس سلسلہ میں کیا حکم دیتی ہے؟

جواب میت کو موت کے بعد رخصت کرنا کوئی مطلوبہ سنت نہیں ہے۔ لیکن علماء کہتے ہیں کہ میت کو بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ علماء کی دلیل حضرت ابو بکر کا ایک عمل ہے۔ نبی اکرم کے انتقال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق حجرہ مبارکہ میں گئے۔ اس وقت نبی کا جسد مبارک کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ حضرت ابو بکر نے چہرہ سے کپڑا اٹھایا، بوسہ لیا اور یہ الفاظ کہے "میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ کی زندگی بھی بہترین تھی اور موت بھی۔ اللہ آپ کو ایک ساتھ دو موتیں نہیں دے گا۔"

آج کل کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ میت کو کسی جگہ پر رکھ دیتے ہیں جہاں آخری دیدار کے لئے میت کے دوست احباب اور رشتہ دار ایک ایک کر کے گزرتے ہیں، یہ عمل بدعت ہے۔ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ وداع میت کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ جو ہوا وہ حضرت ابو بکر کا مذکورہ بالا عمل ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث ہے "جنازہ کی تدفین میں جلدی کرو، کیونکہ میت اگر نیک ہے تو تم اسے ایک خیر کی طرف لے جا رہے ہو اور اگر بد ہے تو تمہارے کندھوں سے بدی جلدی اتر جائے گی۔" نبی کا عمل بھی ایسا ہی تھا۔ آپ غسل میت، تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ میں جلدی کرتے تھے۔ آج کل لوگ جنازہ کے سلسلہ میں بڑی تاخیر کرتے ہیں۔ دور دراز سے اعزہ و اقارب کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، بسا اوقات میت ایک ایک دو دو دن پڑی رہ جاتی ہے۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ لوگوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیۓ۔ یہ ایک طبعی امر ہے کہ مرنے والا اگر مومن ہے تو اس کے لئے سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ وہ اللہ کی تیار کردہ نعمتوں کی طرف جلد از جلد پہنچ جائے۔ چنانچہ جب کسی صالح شخص کا جنازہ گھر سے نکالا جاتا ہے تو اس کا نفس کہتا ہے مجھے جلدی لے چلو مجھے جلدی لے چلو۔

میت کے اہل خانہ کو میت کی تجہیز و تکفین جنازہ اور تدفین میں جلدی کرنی چاہیۓ۔ دو تین گھنٹے انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے کچھ زیادہ بھی انتظار کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی ایسے قریبی شخص کی آمد کا انتظار ہو جس کے بغیر نماز جنازہ متاثر ہو سکتی ہے۔ ویسے قبر پر بھی نماز (جنازہ) پڑھی جا سکتی ہے (اگر نماز جنازہ فوت ہو گئی ہو) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کی قبر پر نماز (جنازہ) پڑھی ہے۔ عورت مسجد کی صفائی کیا کرتی تھی ایک رات اس کا انتقال ہو گیا، صحابہ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے انتقال کی خبر اس رات نہیں دی کہ مبادا آپ کو زحمت ہو، گویا اس مرحومہ (رضی اللہ عنھا) کا انتقال ان کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا۔ نبی کے پوچھنے پر جب لوگوں نے بتایا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے تو آپ نے فرمایا "تم لوگوں نے مجھے اس کے بارے میں اسی وقت کیوں نہیں بتایا" پھر آپ نے اس کی قبر معلوم کی اور وہاں جا کر نماز پڑھی۔ اس طرح کسی دوست اور رشتہ دار کی نماز جنازہ اگر فوت ہو جائے تو بعد از تدفین پڑھی جا سکتی ہے حتی کہ ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی۔

سوال تلاش معاش کے سلسلہ میں سفر پر نکلا ہوا شخص کتنی مدت تک اپنی بیوی سے

دور رہ سکتا ہے؟

جواب تلاش معاش ہو یا جہاد فی سبیل اللہ یا اور کوئی کام، شوہر اپنی بیوی سے صرف چار مہینے دور رہ سکتا ہے۔ یہی مدت اللہ تعالی نے ایلا کرنے والوں کے لئے مقرر کی ہے۔ قرآن کہتا ہے "**للذین یولون من نسائھم تربص اربعہ اشھر**" وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ایلا کرتے ہیں، ان کے لئے چار مہینے کا انتظار ہے۔

حضرت عمرؓ نے اسلامی لشکر کے مجاہدین کے لئے اس آیت کریمہ سے استنباط کرتے ہوئے چار مہینے کی مدت مقرر کی تھی، سفر کی آمد و رفت کے پیش نظر حضرت عمر نے اس مقررہ مدت میں مزید دو مہینوں کا اضافہ کیا تھا۔ اس طرح گویا ایک شخص کو اپنی بیوی سے چھ مہینے دور رہنے کی اجازت مل گئی تھی لیکن مزید دو مہینوں کی مہلت سفر کی دشواریوں کے ساتھ مشروط تھی۔ اگر ممکن ہو تو شادی شدہ آدمی کو چار مہینے میں اپنے گھر ضرور واپس آنا چاہئے۔ کوئی بہت بڑی دشواری یا (بحالت جہاد) امیر عساکر کی اجازت ہی اسے مزید مہلت دے سکتی ہے

سوال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث کے مطابق بچہ کا عقیقہ ساتویں دن یا ۱۴ویں یا ۲۱ویں دن کر دینا چاہئے لیکن اگر ایسا ہو کہ میرے یہاں بچہ کی ولادت ہو اور میرے شوہر کسی دوسرے ملک میں مقیم ہوں جہاں مجھے پہنچنے میں چند مہینے لگ جائیں، تو ایسی صورت میں کیا حدیث کی مقرر کردہ مدت کے اندر ہی عقیقہ کر دینا ضروری ہے یا شوہر سے ملاقات تک ملتوی کیا جاسکتا ہے؟

جواب عقیقہ کی تاخیر میں کوئی حرج نہیں ہے۔ والدین کے حق میں جو وقت مناسب ہو اس وقت تک ٹالا جاسکتا ہے۔ ساتویں دن یا چودھویں دن یا اکیسویں دن عقیقہ کرنا افضل ہے اگر سہولت ہو۔ اور اگر دشواری ہو تو تاخیر کی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ ملحوظ رہے کہ عقیقہ کرنا ضروری ہے اور باپ پر بیٹے کا ایک حق ہے۔

سوال میں نے اپنی پوری میراث اپنی ماں کے حوالے کر دی ہے۔ کیا میرے اس عمل پر شوہر کو اعتراض کرنے کا حق ہے؟ اور کیا کسی شوہر کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ اپنی بیوی کے مال یا اس کی تنخواہ میں سے کچھ رقم جب چاہے لے لے؟

جواب اگر آپ اس ورثے کی مالک ہیں یعنی جو کچھ آپ نے اپنی والدہ کے حوالے کیا ہے اگر وہ والدین یا عزیز و اقارب سے ملا ہے تو وہ آپ کی ملکیت شمار ہوگا۔ آپ اسے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ آپ اس میں سے چاہیں کسی کو تحفہ دیں، صدقہ خیرات کریں، آپ پر کوئی قرض ہو تو اس کی ادائیگی کریں، کسی قریبی یا دور عزیز کو اس کا وارث بنانا چاہیں تو وارث بنادیں، غرضیکہ یہ سب آپ کے اختیار میں ہے اور اگر آپ عاقل و بالغ ہیں تو آپ کے شوہر کو ایسے کسی فیصلے پر اعتراض کا حق نہیں ہے۔ آپ کے شوہر کو آپ کے مال میں سے کچھ بھی خرچ کرنے کا حق نہیں ہے جب تک کہ آپ اس کی اجازت نہ دے دیں۔ ہاں اگر آپ ملازمت کرتی ہوں اور یہ ملازمت شوہر کے بعض حقوق کی ادائیگی میں حارج ہوتی ہو تو ایسی صورت میں شوہر کچھ شرطیں عائد کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ درست ہوگا کہ شوہر و بیوی دونوں اپنی تنخواہ یا آمدنی کو آپس میں تقسیم کرلیں۔ شوہر بیوی کو ملازمت جاری رکھنے کی اجازت دینے اور اسے لانے لیجانے کے عوض اسکی تنخواہ کا کچھ حصہ لے سکتا ہے۔

سوال کوئی لڑکی یا عورت اسکول، کالج، اسپتال یا رشتہ داروں کی ملاقات کے لیے جارہی ہو تو کیا نکلنے سے پہلے میک اپ کرنا جائز ہے؟

جواب لڑکی یا عورت کے لیے میک اپ کرنا اس حالت میں جائز ہے جب وہ میک اپ کر کے عورتوں کی کسی تقریب میں جارہی ہو۔ یعنی ایسی جگہ جہاں صرف عورتیں ہوں اور جب اس کا تعین ہو کہ راستے میں اسے مردوں کی بھیڑ بھاڑ سے ہو کر گزرنا نہیں پڑے گا۔ جہاں تک سوال ہے ایسی جگہوں پر میک اپ کر کے جانے کا جہاں مرد ہوں یعنی بازار وغیرہ تو یہ جائز نہیں ہے۔ مردوں کی مجلس اور مساجد میں اس کا آرائش کر کے جانا فتنے کا سبب بن سکتا ہے اور اسلام کسی ایسے عمل کی اجازت نہیں دیتا جس میں فتنے کا اندیشہ ہو۔

سوال افزائش حسن کے طریقوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور بیوٹیشین کا کورس کرنے یعنی حسن کاری کا ہنر سیکھنے سے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب شیخ محمد بن صالح العثیمین کے نزدیک زیبائش کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو کسی عیب کو دور کرنے یا چھپانے کی غرض سے کیا جائے جو کسی حادثے کے نتیجے میں لاحق ہوا ہو۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص جس کی ناک جنگ میں کٹ گئی تھی اجازت دی تھی کہ وہ سونے کی ناک لگالے۔

دوسری قسم ہے غیر ضروری آرائش کی۔ اس کا مقصد کسی عیب کو ڈھانکنا نہیں ہوتا بلکہ حسن کو بڑھانا ہوتا ہے اور یہ طریقہ جائز نہیں ہے اس لیے کہ اللہ کے رسول نے مصنوعی زیبائش اور اپنے جسم پر گدوانے والے مردوں اور عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔ ہاں اگر کوئی طالب علم پلاسٹک سرجری کا کورس بڑھ رہا ہے تو اسے سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ ان مواقع پر اس کا استعال نہ کرے جو ناجائز قرار دئے گئے ہیں اور ایسے طریقوں پر عمل کرنے کا اگر کوئی شخص اس سے مطالبہ کرے تو وہ اسے ناجائز عمل سے باز رہنے کی نصیحت کر سکتا ہے۔

سوال کیا کسی عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شوہر سے اس بنا پر طلاق کا مطالبہ کرے کہ شوہر خطرناک مرض میں مبتلا ہے جس سے صحت یاب ہونے کی کوئی امید بھی نہیں ہے اور اس کا اندیشہ بھی ہو کہ اس سے علیحدگی نہ ہونے کی صورت میں وہ کسی فتنے میں گرفتار ہو جائے؟

جواب شوہر اگر وظیفہ زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہے اور فتنے کا اندیشہ ہو تو عورت اس سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ عورتوں کو کسی شرعی سبب کے بغیر مطالبے کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اور شوہر کی عدم صلاحیت کی بناء پر جو خرابی پیدا ہو سکتی ہے اس کے پیش نظر عورت کا عذر شرعی حیثیت رکھتا ہے اور اس لیے اس کی طرف سے طلاق کا مطالبہ جائز ہوگا۔ □

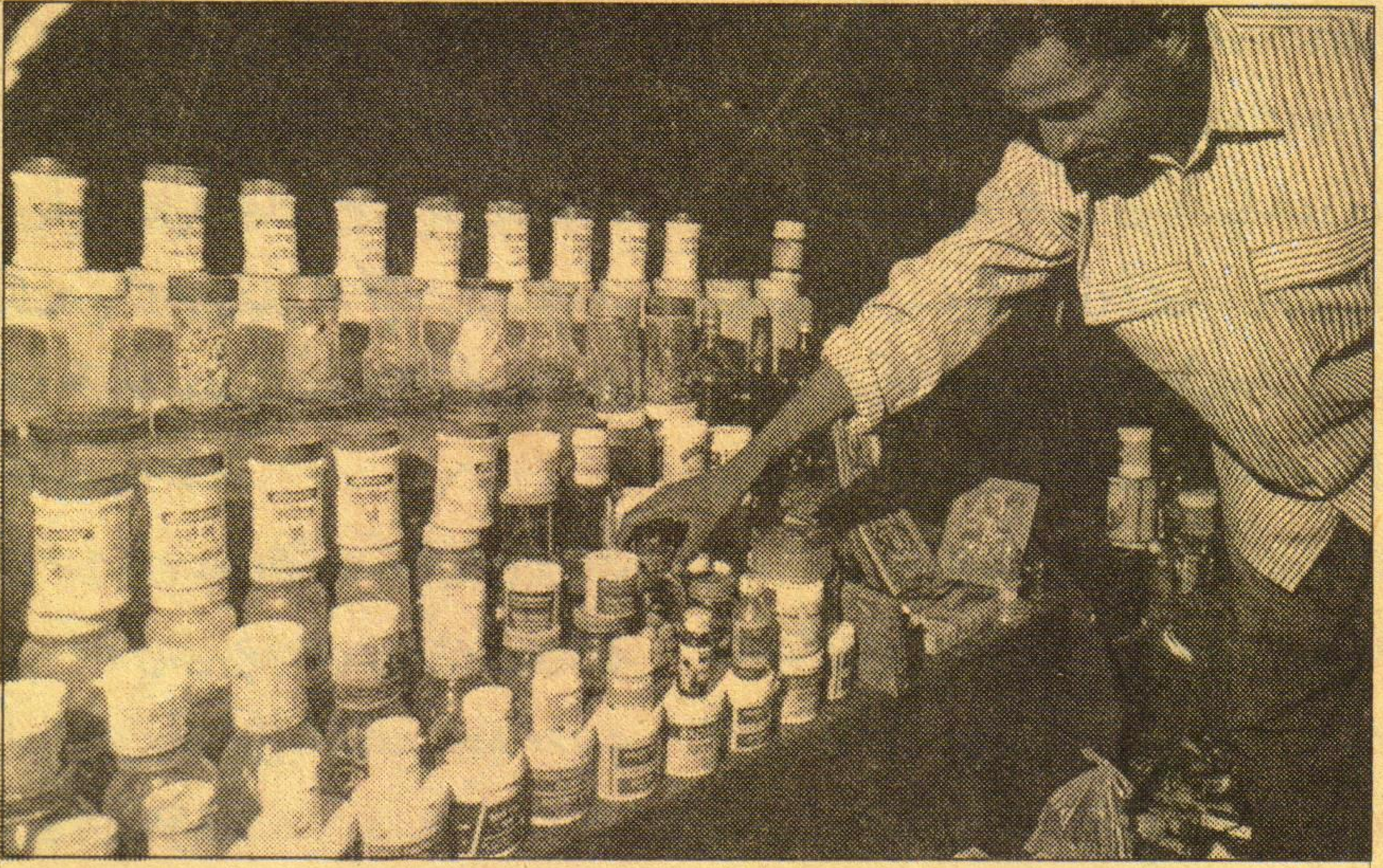
ویاگرا کی کلوننگ

ہندوستان میں کامیابی کے روشن امکانات

نامردی دور کرنے والی دوا ویاگرا گولی امریکہ میں ہی دس ڈالر سے کم قیمت پر فروخت ہو رہی ہے ورنہ تھائی لینڈ کے استثناء کے ساتھ جہاں اس کی مقامی فروخت کی اجازت ہے۔ پورے ایشیا میں اسی ڈالر تک میں ایک گولی بک رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس حیات افزا دوا پر بلیک مارکیٹنگ چل رہی ہے لیکن یہاں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک سال کے اندر ویاگرا کا ایک سستا متبادل ایجاد کر لیا جائے گا جس کی تاثیر کسی طرح اس سے کم نہ ہوگی۔ ویاگرا کا بنیادی جز Sildenafil Citrate تیار کرنے کے لیے مدراس کی آرچڈ کیمکلز اور بمبئی کی سپلا جیسی کمپنیاں اس کے پیٹنٹ کرانے کے مرحلے سے گزر کر میدان میں آئی ہیں اور اس مواد کی بڑی مقدار میں درآمد کی اجازت حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

ویاگرا تیار کرنے والی امریکی فائزر کمپنی اس صورت حال کے آگے بے بس ہے کیونکہ ہندوستانی قوانین کی رو سے دوا سازی کا پروسس پیٹنٹ کیا جاتا ہے نہ کہ بذات خود کوئی دوا، جیسا کہ بیشتر ممالک میں ہوتا ہے۔ اسلیے ہندوستان مینو فیکچروں کی نظر اس پہلو پر ہوتی ہے کہ دوا کا فارمولا کیا ہے؟ اس میں وہ تھوڑی بہت تبدیلی کر کے پیٹنٹ کے درخواست گذار ہو جاتے ہیں اور اسطرح لوگوں نے کروڑوں کی دولت کمائی ہے۔ اسکی ایک مثال بمبئی کی لیوپن لیبوریٹری کی ہے جس نے تپ دق میں کام آنے والی امریکی دوا کے جزو اعظم کا فارمولا پیٹنٹ کروا کر تپ دق کی دواؤں کے ۷۰ فیصد بازار پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اسی طرح گلیکسو اور رین بیکسی نے ترقی پذیر ممالک میں سستے داموں پر اپنی دوائیں فروخت کر کے امریکی اور یوروپی دوا ساز فرموں کو پیچھے کر دیا ہے خصوصا انٹی بایوٹکس کے میدان میں۔

دوا سازی کے فارمولے پر مبنی ہندوستانی قانونی پیٹنٹ مغربی فارماسیوٹکل کمپنیوں کو خاصا برافروختہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ ان قوانین کا اطلاق صرف دواؤں اور زرعی کیمیائی مادوں پر ہی ہوتا ہے جب کہ کمپیوٹر سافٹ ویر، موسیقی کے آلات اور دیگر مصنوعات مغربی قوانین کے تحت محفوظ ہیں۔ تاہم ان قوانین نے ہندوستان کو ایک بڑی مقامی صنعت کے قیام میں مدد دیا ہے اور اس صنعت سے وابستہ ایک ذمہ دار کے مطابق جلد ہی ہندوستان دوا سازی کے میدان میں سب سے بڑی صنعت کا درجہ حاصل کر لے گا، کیونکہ نقل شدہ دوائیں ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ان ممالک میں بھی فروخت ہوتی ہیں جہاں مصنوعات کی پیٹنٹ کا ضابطہ نافذ نہیں ہے مثلا افریقی ممالک اور لاطینی امریکہ، سابق سوویت اور مشرق وسطی۔ اس طرح فروخت ہونے والی دواؤں کی فہرست میں ویاگرا کا اضافہ ہونے والا ہی ہے اور آرچڈ کیمکلز کے ایک ذمہ دار کا کہنا ہے کہ جو کچھ ہندوستان میں اس سلسلے میں ہو رہا ہے وہ قانون کے دائرے میں مکمل طور پر جائز ہے۔ جیسے ہی اس کمپنی نے ویاگرا کی نقل تیار کرنے کا اعلان کیا اسٹاک مارکیٹ میں اس کے حصص کی قیمت میں 58% کا اضافہ ہو گیا اور یہ کمپنی اپنی تیار کی ہوئی دوا کو ظاہر ہے انہیں ممالک میں فروخت کرے گی جہاں پیٹنٹ کے قانون کا تعلق فارمولے سے ہے نہ کہ بنی بنائی دوا سے۔ کمپنی کا دعوی ہے کہ اس کے پاس پہلے ہی چالیس ٹن کا آرڈر آچکا ہے اور فائزر نے ابھی تک اپنی دوا کو ہندوستان میں رجسٹر نہیں کروایا ہے۔ اس لیے اس کا امکان نہیں کہ ویاگرا کھلے بازار میں جلد بکنے لگے گی۔



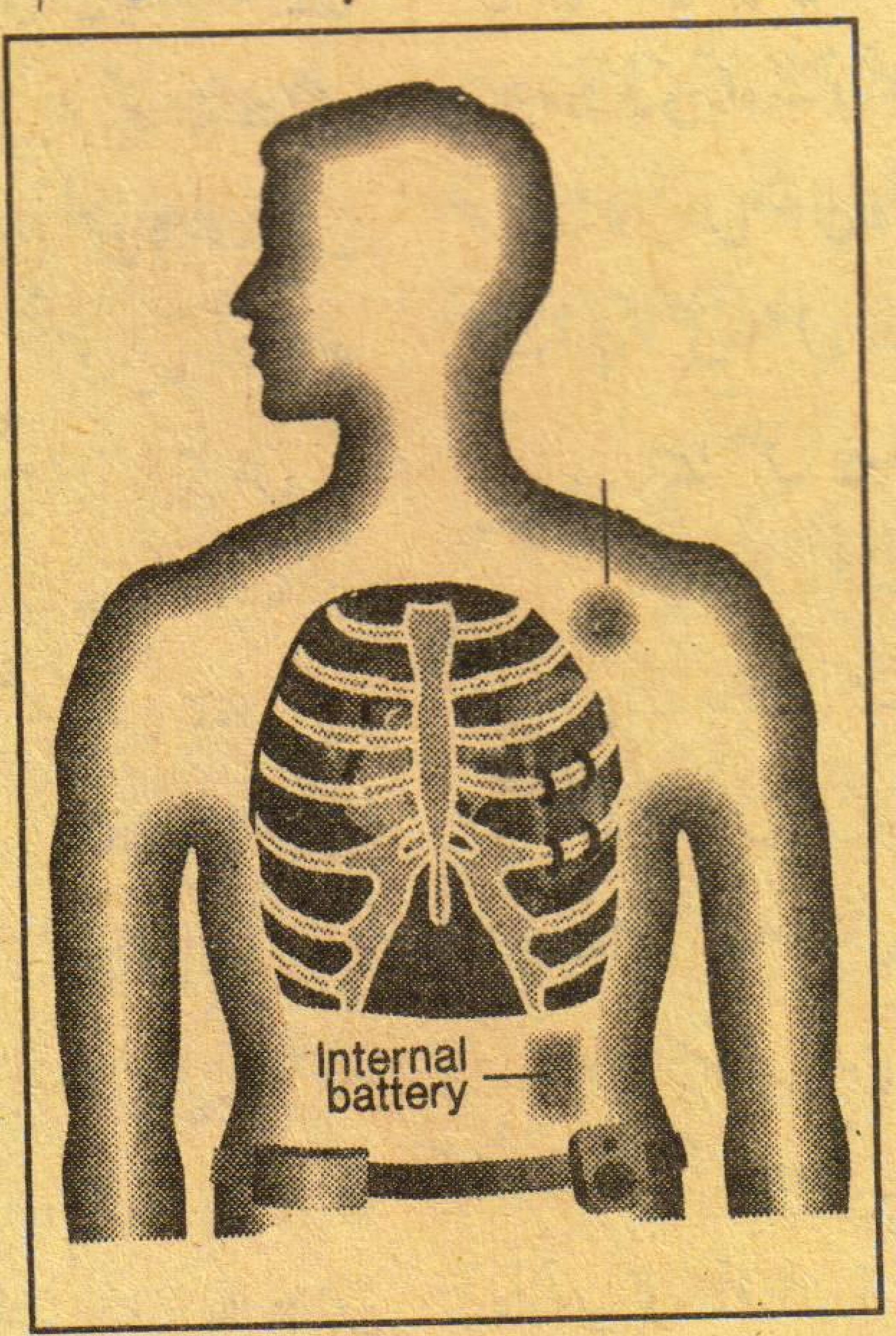
بعض مقامی کمپنیاں ایک تبدیلی لانا چاہتی ہیں۔ حیدر آباد میں قائم ڈاکٹر ریڈی لیباریٹریز نے تقریبا دو سو نئی دوائیں ایجاد کی ہیں اور ان میں سے بیشتر کو امریکہ اور یوروپ میں پیٹنٹ کرا لیا ہے۔ جہاں وہ اس کی جانچ تجزیہ نہ کر سکتے ہوں وہاں انھوں نے غیر ملکی ساجھے داروں سے اشتراک کر لیا ہے۔ حال ہی میں اس لیباریٹری نے ڈنمارک کی نوو تارڈسک کمپنی سے ذیابیطس کی ایک دوا تیار کرنے کی غرض سے اشتراک کیا ہے، جس سے قریبی ذرائع کے مطابق ریڈی لیبارٹریز کو بے پناہ منافع ہوا جسے وہ ذہنی جائیداد سے پیسہ کمانے سے تعبیر کرتی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے ایک ممبر کی حیثیت سے ہندوستان نے ۲۰۰۵ تک اپنے قوانین پیٹنٹ کو بدلنے کا دعوی کیا ہے لیکن اس سے پہلے ویاگرا کی نسل سے یہاں کی دوا سازی کی صنعت خاصی دولت بٹور چکی ہوگی۔ ▭

جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اب نیا مصنوعی دل بازار میں

مصنوعی دل کے تجربوں سے متعلق پہلے سے معروف ایک ٹیکنالوجی کی نوک پلک درست کر کے کناڈا کی ایک تجارتی تنظیم مستقبل میں مصنوعی دلوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے وسیع امکانات پر آنکھیں لگائے ہوئے ہے۔

کناڈا کے اونٹاریو شہر میں قائم ورلڈ ہارٹ کارپوریشن کے نام کی یہ تنظیم اگرچہ اپنے شیر ہولڈروں کو ابھی کوئی منافع نہیں دے رہی ہے لیکن ۲۰۰۱ میں اس کا پہلا منافع ۱۲ ملین ڈالر ہو جائے گا جب وہ اپنی فروخت کا ایک سال پورا کر لے گی۔



طبی محققوں اور ہائی ٹیکنولوجی میں دلچسپی رکھنے والے تاجروں کی جماعت کی مدد سے چلنے والی ورلڈ ہارٹ کارپوریشن ان کئی کمپنیوں میں سے ایک ہے جو ہارٹ فیل کے عارضے میں مبتلا دنیا کے لاکھوں افراد کے لیے مصنوعی دلوں کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کی بنائی ہوئی مشین جس کا برانڈ نام "ہارٹ سیور" ہے لوگوں کو کچھ تو اپنے پاور سپلائی کے طریقے کی بناء پر متوجہ کر رہی ہے اور کچھ اپنے کمپیکٹ ڈیزائن کی وجہ سے۔

مصنوعی دلوں کو عموماً پاور سپلائی کسی خارجی ذریعے سے ہوتی ہے جس میں ایسے تار لگے ہوئے ہیں جو جلد کے اندر داخل کر دئے جاتے ہیں۔ یہ وائرنگ مریض کے لیے زحمت کا باعث ہوتی ہے اور اس سے جراثیم پیدا ہونے کا خطرہ بھی رہتا ہے جو دل کے مریضوں کے لیے خاصی تشویش ناک بات ہے۔

ورلڈ ہارٹ کے بنائے ہوئے ہارٹ سیور میں جو خاص بات ہے وہ Left Ventricular-Assist. Device ہے۔ اس میں تاروں کے بجائے الیکٹرو میگنٹیک یعنی برقی مقناطیسی طریقہ کار کو برتا گیا ہے۔ اس کے تحت چھوٹی بیٹری سے چلنے والا ایک کوائل سینے پر باندھ دیا جاتا ہے اور جلد سے ہوتے ہوئے انرجی ایک ایسے کوائل میں منتقل ہوتی ہے جو جسم کے اندر لگی ہوتی ہے۔ یہی کوائل ہارٹ سیور کے پمپ کو انرجی فراہم کرتا ہے۔ انرجی کی منتقلی کے طریقہ کار کی بناء پر اگرچہ ہارٹ سیور اپنی نوعیت کی منفرد مشین ہے پھر بھی کارڈاک ٹرانس پلانٹیشن کے ماہرین کے خیال کے مطابق اس کی کارکردگی کو یقینی بنانے کے لیے انتھک تجربے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے پیش نظر ورلڈ ہارٹ کارپوریشن فی الحال جانوروں پر تجربے کر رہی ہے اور انسانوں پر تجربے کی شروعات اگلے سال سے ہو سکے گی۔ اس کمپنی کا اصل ایک کمپیکٹ اور ہر ممکن حد تک مختصر مصنوعی دل ایجاد کرنا ہے۔ سینے کے پسلیوں کے ڈھانچے کے درمیان یہ آلہ فٹ کرنا مقصود ہے جو کہ ایک نازک کام ہے اور انسانی جسم کے لئے کوئی بھی خارجی چیز بہت چھوٹی نہیں ہوتی۔ بائیں Ventricle دل کا زیادہ تر کام انجام دیتی ہے اس لیے مصنوعی دل کو اسی سے جوڑا گیا ہے اور پورے آلے کی کارکردگی کی مانیٹرنگ اوپر سے ایک ایسے سسٹم کے ذریعے ہوگی جو Infra-red اور ریڈیو ٹرانسمیٹر رسیور موڈیلوں کی مدد سے ڈیٹا منتقل کرے گا۔

ابھی تک دستیاب مصنوعی دلوں میں سے بیشتر خاص طور پر دل کے مریضوں کو اس وقت زندہ رکھنے کے لیے استعمال میں لائے جاتے رہے ہیں جب تک انسانی دلوں کا انتظام نہ ہو سکے لیکن امریکہ میں بھی صرف ۲۴۰۰۰ دل کی تبدیلی کے آپریشن ہر سال ممکین ہو پاتے ہیں کیونکہ عطیہ کیے گئے دلوں کی فراہمی بہت محدود ہوتی ہے۔

ورلڈ ہارٹ کارپوریشن کناڈا کے ایک تاجر راڈرگ برانڈن اور کناڈا ہی کی ایک سافٹ ویر کمپنی کورل کارپوریشن کے پریذیڈنٹ مائیکل کاؤپلانڈ اور کلیولینڈ کلینک کے سابق ٹیکنکل سروس ڈائرکٹر ڈاکٹر موسیواند کی مشترک ملکیت ہے۔

برانڈن اور موسیونڈ یونیورسٹی آف اوٹاوا کے ہارٹ انسٹی ٹیوٹ کے سرجن وبرٹ کیون نے ملازم رکھا تھا اور ہارٹ سیور آلے کی ٹیکنالوجی اسی انسٹی ٹیوٹ نے ترتیب دی اور اسے ۱۹۹۶ میں بازار میں فروخت کی غرض سے ورلڈ ہارٹ کارپوریشن کو منتقل کر دی۔

دیگر مصنوعات کی طرح مصنوعی دل کی صنعت بھی مسابقت سے خالی نہیں ہے۔ چونکہ ورلڈ ہارٹ کارپوریشن

باقی صفحہ ۴۹ پر

کیسا ہے ادب میں اتنا جھکنا جیسے رکوع کر رہے ہوں

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم فیصلے لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوال قرآن کریم میں والدین کی اطاعت کے بارے میں مختلف پیرایوں میں تاکید کی گئی ہے مثلاً یہ کہ ان کے ساتھ اسی طرح شفقت کا برتاؤ کرو جیسا کہ انھوں نے تمھارے ساتھ بچپن میں کیا تھا۔ لیکن میری والدہ کا حال یہ ہے کہ میری بیوی پر طرح طرح سے زیادتی کرتی رہتی ہیں اور جلی کٹی سناتی ہیں اور کوسنے سے بھی باز نہیں آتیں جب کہ اسی گھر میں اور لوگ بھی ہیں جو ان کی لعن طعن کا نشانہ نہیں بنتے۔ وہ میری بیوی کو تمام جھڑکیوں اور گالیوں کا مستحق اس لیے سمجھتی ہیں کہ وہ بانجھ ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مجھ میں ہی خامی ہے۔ اس کے باوجود میری بیوی ماں کے ساتھ ادب سے پیش آتی ہے اور ان کا پورا احترام کرتی ہے اور سارے الزامات اپنے سر اوڑھ لیتی ہے۔ ماں کو میری حالت کے بارے میں اس نے کبھی نہیں بتایا۔

(احمد جبریل، گلبرگہ)

جواب اپنی نسل کو پروان چڑھتے دیکھنا ہر انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ ماں نے بڑے ارمانوں سے آپ کی شادی کی ہوگی اور وہ اس دن کا انتظار کر رہی ہوگی جب ان کے آنگن میں ننھے منے کھیلیں گے۔ اس لیے اپنی بہو سے یہ امید پوری نہ ہونے پر کتنی مایوسی انھیں ہوئی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں قصوروار عورت ہی ٹھہرائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اپنی خامی کا اعتراف عموماً مرد نہیں کرتے اور آپ کو جب اپنے اندر کمی کا یقین تھا تو شادی سے پہلے اپنے گھر والوں کو کسی طرح یہ بات بتانی چاہیے تھی۔ چلیے شادی ہوگئی تو اسکے بعد ہی اپنی ماں کو آپ بتادیتے تاکہ ایک غلط فہمی پیدا ہوجانے سے آپ کی بیوی بلاوجہ زیادتی برداشت کرتی رہی۔

آپ یہ سب تماشہ دیکھ کر کڑھتے رہے لیکن حقیقت ظاہر کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہ کرسکے۔ یہاں تک کہ آپ نے عاجز آکر ماں سے کہہ دیا کہ وہ آپ سے ملنے جلنے کی زحمت نہ کریں، یہ ایک اور ستم ہوا۔ آپ کے اس عمل کو ماں کی نافرمانی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کے نتائج اور خراب ہوسکتے ہیں۔ اگر آپ کی بیوی اور آپ کے درمیان خوشگوار اور میل محبت کے تعلقات نہیں ہیں تو آپ کوشش کریں کہ دونوں کے درمیان جو کشیدگی روز ہوتی رہتی ہے اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کبھی بھی اپنی بیوی کی حوصلہ افزائی یہ کہہ کر نہ کریں کہ وہ ماں کی باتوں کا جواب دے بلکہ کہ جو کچھ وہ کہیں اسے ٹھنڈے دل سے سن لے۔ کیونکہ صبر ہی مشکل سے نکلنے کی کنجی ہے۔ ظاہر ہے ایسا اسی وقت ممکن ہوگا جب آپ کی والدہ آپ کے گھر ملنے کے لیے آئیں گی۔ اس کے بعد آپ اپنی والدہ سے ملنے جائیں اور انھیں ترغیب دیں کہ گھر میں جو معاملات چل رہے ہیں اس پر دوبارہ غور کریں۔ انھیں بتائیں کہ جس محرومی کا انھیں قلق ہے اس کی ذمہ دار آپ کی بیوی نہیں ہے بلکہ اس میں کوتاہی آپ کی ہے اور جب ایسا ہے بھی تو اس میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ علاج معالجے کی راہ بند تو نہیں ہوگئی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ پہلے اپنے گھر کے ماحول میں سکون لائیں اس کے بعد کوئی تدبیر اختیار کریں جس سے اولاد جیسی نعمت آپ کو بھی حاصل ہو۔

سوال میرا تعلق ایک ایسے قصبے سے ہے جس کے باشندے صوم و صلوۃ کے پابند ہیں۔ اللہ کی وحدت اور محمدؐ کی نبوت پر ایمان کا اعلان کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بڑے بزرگوں اور مقتدر لوگوں کو سلام کرتے ہوئے ان کے آگے جھکتے بھی ہیں جس سے ان کا زیادہ احترام ظاہر ہو۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ایسے ہی ہوجاتے ہیں جیسے نماز میں رکوع کی حالت ہوتی ہے۔ میں نے اس پر اعتراض کیا تو کئی لوگ جوابی اعتراض مجھ پر کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ میں فروعی معاملات میں بہت شدت اختیار کر رہا ہوں کیونکہ ان کا یہ عمل احترام کا اظہار تھا نہ کہ عبادت۔ بعض افراد نے تو یہ بھی کہا کہ میں آل رسولؐ کے احترام کا مخالف ہوں۔ مجھ پر اعتراض کرنے والوں میں پیش پیش خود میرے والد محترم تھے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے بھی چاہیے کہ بڑوں کا اسی طرح رکوع کی مانند جھک کر احترام کروں۔ بحث طویل ہوتی گئی، میں بھی اپنے موقف پر اڑا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ نکلا۔ بددل ہوکر میں نے گھر چھوڑ دیا اور دوسری جگہ آکر رہنے لگا۔ براہ کرم یہ بتائیں کہ کیا میں اپنی دلیل میں برحق تھا یا نہیں۔

(سلیم احمد، کشن گنج)

جواب امت اسلامیہ عقائد کے معاملات میں اپنی لاعلمی کے باعث طرح طرح کے تفرقوں میں مبتلا ہوگئی ہے۔ قرآن اور سنت کے احکام کے بارے میں ادھوری معلومات کا اس میں بڑا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ جاہلوں اور مکاروں کی اتباع کرکے گمراہی میں پڑجاتے ہیں۔ رسولؐ، آل رسولؐ اور

صحابہ کرام کا احترام قرآن وسنت سے ثابت ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ شرعی حدود کو ملحوظ رکھا جائے اور اس سے تجاوز نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہی محترم اشخاص خود کے ولی اور پیغمبر ہونے کا دعوی کر بیٹھیں گے جیسا کہ گذشتہ صدیوں میں اس طرح کے واقعات ہو چکے ہیں۔ رکوع اور سجود کی حد تک اللہ کے سوا کسی کے آگے تعظیما جھکنا جائز نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت معاذ شام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کے سامنے جھک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا معاذ یہ کیا کر رہے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا یا رسول اللہ شام میں میں نے لوگوں کو اپنے اسقفوں یعنی پادریوں کے سامنے اسی طرح سجدہ ریز ہوتے ہوئے دیکھا ہے تو میں نے سوچا کہ واپس جا کر میں بھی آپ کی تعظیم اسی طرح کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا ہرگز نہ کرو۔ انس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کیا وہ شخص جو اپنے بھائی یا دوست سے ملتے ہوئے اس کے آگے جھکتا ہے ٹھیک کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر اس نے پوچھا اگر وہ ملتے وقت اسے لپٹتا ہے اور بوسہ دیتا ہے تو وہ ٹھیک ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے پھر پوچھا اگر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرتا ہے تو کیا یہ ٹھیک ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ ▭

بقیہ: اب نیا مصنوعی دل بازار میں

منافع کمانے کی غرض سے مالکانہ حقوق کے نظام کے تحت چل رہی ہے، اس کی دیکھا دیکھی دیگر کمپنیاں بھی میدان میں آنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ باوجود اس کے کہ ہارٹ سیور میں بہت سی نئی خصوصیات ہیں اور امید ہے کہ اس کا آغاز بہت خوش آئند ہوگا لیکن مشکل یہ ہے کہ ورلڈ ہارٹ کارپوریشن کے ساتھ ساتھ اس وقت امریکہ اور کناڈا میں ایک درجن کمپنیاں اسی نہج پر مصنوعی دل کے تجربے میں مصروف ہیں جن میں ورلڈ ہارٹ سے زیادہ مستحکم مثلاً تھرمو کارڈیو سٹمبر جیسی فرمیں شامل ہیں جو تھرمو الیکٹرون کارپوریشن کا ذیلی ادارہ ہے۔ اس کے علاوہ بیکسٹر انٹرنیشنل اور تھوریٹک لیبوریٹریز بھی میدان میں ہیں۔

ہارٹ سیور اپنی تجرباتی شکل جسے ایک ورک نیچے پر اسی روز تک چلانے کے لیے ۱۹۹۲ میں لگایا گیا تھا، آج ساڑھے پانچ سال بعد بھی ارجی پمپ کر رہا ہے۔ تاہم اگرچہ اس کا کام تشفی بخش طور پر چل رہا ہے بات تو جب ہے کہ یہ مصنوعی دل مریض کے جسم کو بھی راس آجائے۔ ▭

بقیہ: نئی کتاب

ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان بہت سی اصطلاحات کی تعریف کی ہے جو نسل پرستی کے کٹر حامی لوگ اپنی تقریروں میں بار بار استعمال کرتے ہیں۔ آگے چل کر جلون اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اجنبی کسے کہتے ہیں اور کون سے عوامل ہیں جو کسی فرد یا گروہ کو دوسروں کے لیے اجنبی بناتے ہیں۔ نیز یہ کہ کسی معاشرے یا قوم کے لیے اجنبی کی حیثیت کیا ہوتی ہے اور خود اس اجنبی کی نظر میں اس معاشرے یا قوم کی کیا حیثیت ہوتی ہے جن کے درمیان وہ خود کو پاتا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو چیز جغرافیائی یا تہذیبی اعتبار سے ہم سے مختلف ہو کوئی ضروری نہیں کہ ہم اس سے خوف کھائیں یا اس کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔

اس کے علاوہ جلون نے سیاسی تقریروں اور مرض کی حد تک فرانس میں آباد غیر ملکیوں سے نفرت کے رویے کی نفسیات اور اس میں جھلکنے والی سازشانہ بدنیتی کا پردہ فاش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ نفسیات کس طرح اجنبی نسلوں کو نکال باہر کرنے اور ان کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھنے پر اکساتی ہے جو نسلی حق تلفی اور تفرقے کو ہوا دے اور آخر ایک ایسی صورت حال پیدا ہو جس سے سماجی اور تہذیبی زندگی میں ایک گھٹن کا ماحول سرایت کر جائے۔ مصنف نے اس سے بھی بحث کی ہے کہ اقتدار حامی تحریکیں کس طرح فرانس میں تارکین وطن کی موجودگی کو ایک ایسی مصیبت کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہیں جسے تمام تر سماجی برائیوں اور کمزوریوں یہاں تک کہ ملک کو درپیش اقتصادی مشکلات کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔ یہ تحریکیں اسی پر بس نہیں کرتیں بلکہ اپنے نسل پرستانہ مفروضوں کو تقویت بخشنے کی کوشش میں اس وعدے کے ساتھ بعض دلیلیں پیش کرتی ہیں کہ ان کی تصدیق علمی تحقیق سے ہو چکی ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ مختلف انسانی نسلوں کے درمیان ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں فرق مسلم ہے۔ مثلاً یہ کہ سیاہ نسل کے لوگ عقل و فہم میں کمتر ہوتے ہیں اور وہ لوگ کاموں میں زیادہ ماہر ہوتے ہیں جن میں ہاتھ پیر کا استعمال درکار ہو اور یہ مہارت ان میں نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ آخر میں کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ نسلی توارث پر مبنی یہ منطق کسی طرح بہت سے نسلی تعصب کے رویوں کا سبب بنی ہے جن کے آثار ایک طویل انسانی تاریخ کی پیشانی پر آج بھی موجود ہیں اور جس نے کالی نسل کے انسانوں کو صدیوں تک محکوم اور غلام بنا کر رکھا ہے اور پوری دنیا میں نسلی جنگ کے شعلے بھڑکائے ہیں۔ ▭

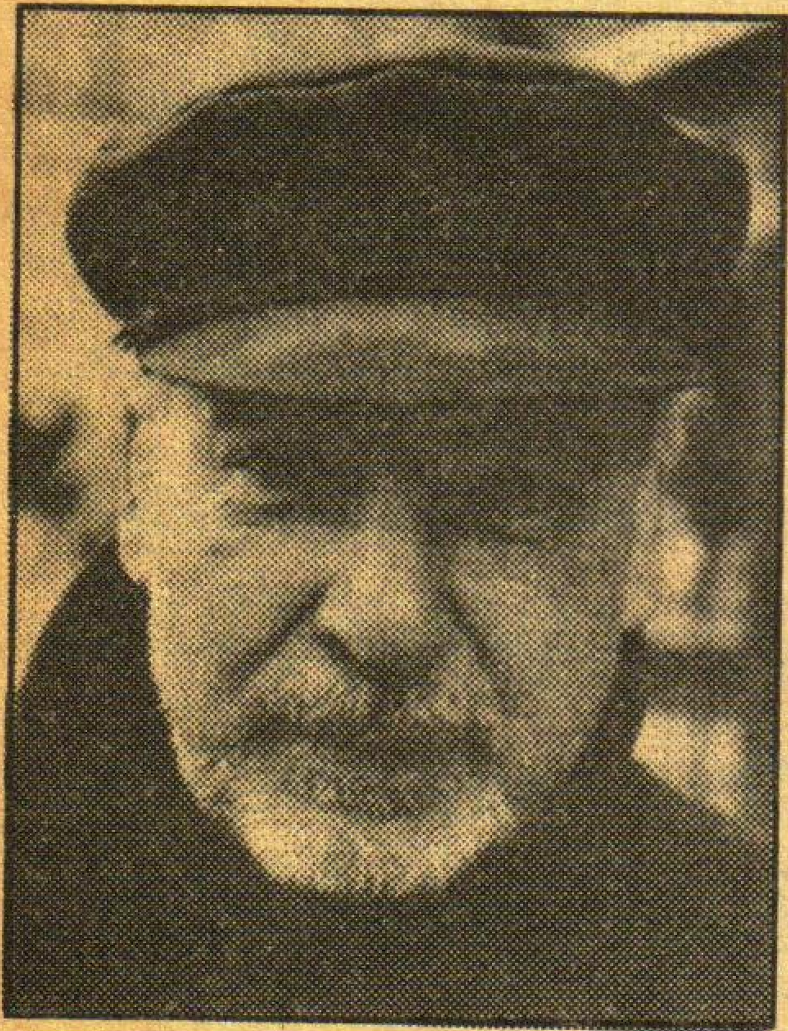
نسلی برتری کے احساس کو بچپن ہی میں کچل دینا چاہیے

طاہر بن جلون کی نئی کتاب "نسل پرستی کی تشریح: اپنی بیٹی کے لیے" پر ایک تبصرہ

۱۹۸۵ کے جونکور انعام یافتہ الطاہر بن جلون کا شمار فرانسیسی زبان میں لکھنے والے مغربی عرب کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کے حالیہ ترین تصنیف جس نے فرانس میں بیسٹ سیلر کی حیثیت حاصل کی اس کا عنوان ہے "نسل پرستی کی تشریح: اپنی بیٹی کے لیے" اس کتاب کی اشاعت نے قارئین کو تو چونکایا ہی خود مصنف کے لیے بھی یہ کم حیرت کا باعث نہیں ہے۔ جلون نے یہ کتاب طلباء اور بچوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی تھی کہ انھیں نسل پرستی کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملے گی لیکن ہوا یہ کہ سب پیر و جواں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جب جلون نے فرانس کے دورے کے درمیان اسکولوں میں بعض طلباء سے ملاقات کی تو انھوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ اس کتاب کے نسخے اپنے رشتے داروں کو تحفتاً دیں گے تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ ان کا سلوک کس حد تک نسل پرستانہ ہے۔

جلون نے اس کتاب میں نسل پرستی کے مسئلے اور فرانس میں مقیم عرب مہاجرین پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے کا خیال انھیں اس وقت آیا تھا جب ان کی گیارہ سالہ بیٹی نے میڈیا کی طرف سے بعض اہم واقعات کی مسخ شدہ پیش کش پر رد عمل کا اظہار کیا۔ مثلاً نسلی تحریکیں اور تنازعے۔ اور اس ارادے کو مزید تقویت اس وقت ملی جب فرانس میں باسکو قانون کے نام سے معروف قانون ہجرت کے بارے میں آپسی جھگڑے ہونے لگے۔ اس ضمن میں جناب جلون نے بتایا کہ انھوں نے ۱۹۹۶ میں اس قانون کے خلاف باشعور شہریوں کے احتجاج میں شرکت کی ترغیب اپنی بیٹی کو دی تھی۔ اس کے بعد سے تو اس لڑکی نے نسل پرستی سے متعلق سوالات کی بوچھار کردی جن کا فوری اطمینان بخش جواب ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ آخر انھوں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ دونوں کسی وقت ایک جگہ بیٹھ کر اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

واقعہ یہ کہ جب مصنف نے مریم کو نسل پرستی مخالف احتجاج میں شرکت کا مشورہ دیا تھا اسی وقت انھیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ فرانس میں آباد تارکین وطن پر عرصہ حیات تنگ ہوتا جارہا ہے۔ اور ان کے خلاف تعصب میں



مصنف طاہر بن جلون

شدت آتی جائے گی کیونکہ زور پکڑتی ہوئی شدت پسند یا اقتدار نواز تحریکیں ۱۹۸۰ کی دہائی میں سیاسی منظرنامے پر غالب آچکی تھیں۔ فرانسیسی آبادی کا ایک بڑا حصہ ان کے زیر اثر آچکا تھا جو دم گھٹنے والے اقتصادی بحران سے دوچار تھی۔ روزگار کا بازار اس قدر مندا ہو گیا تھا کہ تیس لاکھ سے زائد فرانسیسی شہری اپنی ملازمتوں سے محروم ہو چکے تھے۔ یہی وہ حالات تھے جنھوں نے فرانسیسیوں کو تارکین وطن کے خلاف سازش پر ابھارا اور انھیں یہ باور کرایا کہ بیشتر عرب مغرب کے ممالک اور افریقہ کی فرانسیسی نو آبادیات سے آنے والے یہ غیر ملکی مزدور ہی ان کے منہ سے لقمہ چھیننے اور بیروزگاری کے غار میں ڈھکیلنے پر تلے ہوئے ہیں۔

جلون کے نزدیک نسل پرستی سے مقابلہ آرائی دراصل تربیتی نوعیت کی ایک مہم ہے کیونکہ جب تک نوجوان نسل کے ذہن میں اس برائی سے لڑنے کا خیال جڑ نہیں پکڑے گا اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوگی اور تربیت جیسا کہ سب جانتے ہیں زندگی کے ابتدائی مرحلے اور کمسنی ہی میں ممکن ہوتی ہے۔ اسی لیے جلون نے اس تصور کو اپنی کتاب میں مرکزی حیثیت دی ہے کہ نسل پرستی ایک سماجی رویہ ہے جس میں تمام یا بیشتر معاشرے مبتلا ہیں۔ اس رویے کا اظہار دوسرے شخص یا کسی اجنبی کے تئیں شکوک یا خطرے عداوت اور حقارت احساس کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس احساس کا سبب اس کا رنگ، شکل و صورت، نسل، مذہب، کلچر، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں جلون نے لوگوں کے درمیان اختلاف اور فرق کی تعریف اور اس کی نوعیت سے بحث کی ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا لوگوں کے درمیان مختلف سطحوں پر مطابقت اور مماثلت مل جل کر رہنے کے لیے لازمی شرط

Membership Form

for a proposed

Muslim Political Party

Form No.:---------

Date:----------------

ملک میں عنقریب ایک مسلم سیاسی پارٹی تشکیل دی جانے والی ہے جو ہندوستانی
مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کے ذریعہ اس ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرے گی۔
مسلمانوں کی موجودہ سیاسی بے سمتی کا خاتمہ ہوگا اور پچاس سالہ سیاسی غلامی کی زنجیریں
کٹ جائیں گی۔ اگر آپ اس پارٹی کے مقصد سے اتفاق کرتے ہوں اور اس ملک میں
منجمد اسلامی ایجنڈے کو دوبارہ متحرک کرنا چاہتے ہوں تو یہ بتائیے آپ اس سلسلے میں کیا
کر سکتے ہیں۔ آج ہی اس فارم کو پر کیجئے اور اللہ کا نام لے کر ہمیں ارسال کر دیجئے۔

Passport Size Photo

Name: ______________________ Father's Name: ______________________ Age: ______

Educational Qualifications: ______________________

Permanent Address: ______________________ Address for Correspondence: ______________________

______________________ ______________________

______________________ ______________________

Phone: ____________ Phone Off.: ____________ Res.: ____________

Health Condition: ❑ Excellent ❑ Good ❑ Poor

Languages Known: ❑ English ❑ Urdu ❑ Hindi ❑ Other

عہد نامہ

میں اس مشن کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دینے کا عزم کرتا ہوں۔
خصوصیت کے ساتھ میں ہر روز ❑ گھنٹہ اس مشن میں کو دوں گا۔ میری خدمت درج ذیل کاموں کے لئے پیش ہے:
اطراف میں سفر ❑ علاقے میں چھوٹے چھوٹے پروگرام منعقد کرنا ❑ لیف لٹ تقسیم کرنا اور اشتہار لگانا ❑
علاقائی زبان میں مسلم پارٹی کے لٹریچر کا ترجمہ کرنا ❑ مقامی طور پر لٹریچر کو طبع کرانا ❑ اس مشن کے مالی تعاون کیلئے اہل ثروت کو آمادہ کرنا ❑
ملی ٹائمز کو بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہونچانا ❑ عوامی رابطے کا پروگرام منعقد کرنا یا کوئی اور خدمت: (تفصیل لکھئے)

____

____

____

Milli Parliament

Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

Tel: +91-11-6827018, 6926296 Fax: +91-11-6946686

E-mail: militime@del3.vsnl. net. in

اس فارم کی فوٹو کاپی کرالیں اور اسے پر کر کے اپنی تصویر کے ساتھ ہمیں ارسال کیجئے

November, 1998
Vol.: V No.: 6

The Milli Times International

Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-25 Fax: +91-11-6946686
Tel.: +91-11-6827018, 6926246 Email: militime@del3.vsnl.net.in

Rs. 8/-
RNI #57337/94



سابق یوگوسلاویہ میں کروشیا کے دارالحکومت زغرب کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ مشکل ہی سے ہوتا ہے کہ بلقان میں گذشتہ کئی برسوں سے مسلمانوں پر مسلسل قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ زندگی اسی طرح رواں دواں ہے، بازاروں میں وہی چہل پہل اور سب کچھ ایسا نارمل جیسے یہ شہر بلقان کا حصہ نہ ہو۔ دور دراز ساحلی علاقوں میں چلے جائیے تو وہاں زندگی کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی نرالا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر سیاحوں کے غول کے غول دھوپ سینکتے اور سمندر کھیلتے ہیں۔ کافی کی پیالیوں پر خوش گپیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ گویا یہ ہماری اس دکھ بھری سرزمین کا حصہ نہ ہو۔

البتہ اسی ہماہمی اور چہل پہل میں اگر کوئی افسردہ چہرہ نظر آجائے، اگر کسی بااسکاف دوشیزہ کی آنکھوں میں خوفناک مایوسی کی جھلک دکھائی دے اور اگر بچوں کی مسکراہٹ پر بزرگ سنجیدگی غالب نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ ان مایوس، محروم اور بے بس اجڑے ہوئے لوگوں کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے ہے۔

بوسنیا کے بعد اب کوسووو سرب صلیبیوں کی زد پر ہے۔ دیکھتے دیکھتے پرسٹینا کا شہر مسلمانوں سے خالی ہوچکا ہے۔ جو بچ گئے انھوں نے اپنے آپ کو تہہ خانوں میں مقفل کر رکھا ہے یا پھر غیر آباد پہاڑیوں پر اس امید میں جا بسے ہیں کہ شاید جلد ہی حالات معمول پر آجائیں اور ان کی واپسی ممکن ہو۔ زغرب کے اسلامی مرکز میں کوسووو سے مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ بوسنیا کے محروم اور یتیم بچے بھی جو سہارے کی تلاش میں یوروپ کے ملکوں میں جانا چاہتے ہیں یہ اسلامی مرکز ان کے لئے پہلا پڑاؤ ہے۔ بلقان کے مختلف حصوں سے آنے والے ان معصوم نونہالوں کا درد ایک ہے وہ یہ کہ ان کا تعلق ایک ایسی امت سے ہے جو کسی سیاسی سرپرستی سے محروم ہے جس کے جان و مال کی کوئی قیمت نہیں، جس کے امور کا نگہباں امت کا خلیفہ کوئی پون صدی سے دنیا کے سیاسی افق سے غائب ہے اور جب امت کے امور کا نگہباں موجود نہ ہو تو امت پر وہی کچھ گذرتی ہے جو کسی گلے بان سے محروم بھیڑوں کے گلے پر گذر سکتی ہے۔

ان نونہالوں میں سے ہر ایک کے سینے میں غموں کا نہ تھمنے والا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ بلقان کی جنگ نے ان معصوموں سے گھروں کا سکون چھین لیا ہے۔ المیر اپنی ماں کی جدائی کا لمحہ یاد کر کے آبدیدہ ہوجاتا ہے جب اس کی ماں کو سرب درندے اس کی آنکھوں کے سامنے اٹھا کر لے گئے۔ عدنان کے باپ اور چچا سرائیوں میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ المیدک برسوں سے اپنے باپ کا راستہ تک رہا ہے۔ اس کا کرب بھی کچھ عجیب ہے، پتا نہیں اس کا باپ سربوں کے کسی عقوبت گاہ میں ہے یا مارا گیا۔ ارناد اور عمر کے آگے پیچھے اب کوئی نہیں رہ گیا ہے۔ انہیں اپنے بچپن کا بوجھ خود اٹھانا ہے۔ المیر کا کہنا ہے کہ وہ سرب درندوں سے انتقام لینا نہیں چاہتا، انتقام ایک منفی جذبہ ہے میں اس سے بچنا چاہتا ہوں۔ البتہ میں لاکھ چاہوں ان خونخوار درندوں کی زیادتیوں کو بھلا نہ پاؤں گا۔ گو کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے عزیز و اقارب کے قتل کا تماشہ دیکھا ہے لیکن میں کبھی ان سے بدلہ لینے کی پوزیشن میں آیا تو انھیں معاف کر دوں گا۔ مسائل کے ہجوم نے ننھے المیر کو فلسفی بنا دیا ہے۔

زغرب کے اسلامی مرکز میں اپنے اساتذہ سے المیر کا مباحثہ برابر چلتا رہتا ہے۔ اسے اس بات کی شکایت ہے کہ یہاں مرکز میں بیشتر لڑکے میدان جہاد سے دور آکر پرسکون مستقبل کا خواب بننے لگے ہیں، یہ رجحان پرورش پانے لگا ہے کہ یہ وقت میدان جہاد کا نہیں، پڑھنے پڑھانے کا ہے۔ ہم اسلحوں سے ہاری جنگ کو تعلیم سے جیت سکتے ہیں۔ بہت سے طالب علم پرسٹینا اور سرائیو کی طرف دیکھنے کے بجائے یورپ کے پرسکون شہروں اور خلیج کی ریاستوں میں آسودہ مستقبل کے متلاشی ہیں۔ المیر کہتا ہے کہ جہاد تو ہماری زندگی کا جزو ہے، حصول علم اس کی نفی نہیں کرتا۔ بظاہر اتنی سمجھ بوجھ کی بات چھوٹے المیر کے منہ سے کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بوسنیا اور کوسووو سے بھاگ کر جو لوگ پرسکون شہروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور جو یہ دلیل لاتے ہیں کہ وہ مستقبل کی اسلامی ریاست کے لئے خود کو تیار کر رہے ہیں، وہ دراصل اپنی بزدلی کو چھپاتے ہیں۔ جب بلقان سے مسلمانوں کا نام و نشان ہی مٹ گیا تو پھر یہ لوگ مستقبل کی اسلامی ریاست کہاں قائم کریں گے؟ المیر سے کوئی اتفاق کرے یا نہیں اس کی باتوں میں اتنی صداقت تو ضرور ہے کہ جب تک امت کے اندر مجاہد اور دانشور ایک شخصیت میں جمع تھے، اس امت کا سیلاب پوری دنیا پر پھیلتا جاتا تھا البتہ جب سے دانشوروں نے تلواروں سے تعلق توڑ لیا اور اصحاب تقوی نے اسلحوں کو تقوی کے خلاف جانا تب ہماری امت کا زوال تیز ہوتا گیا۔ چھوٹا المیر باتیں فلسفی جیسے کرتا ہے، اپنے اسکول میں وہ اپنی ذہانت کے لئے مشہور بھی ہے اور ہر لمحہ اس کا دل میدان جہاد میں اٹکا محسوس ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مکمل مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل پیروی کی جائے جہاں عالم، داعی، خطیب اور نہ جانے کیا کیا کیسے کیسے عظیم پہلو آپ کی ایک شخصیت میں جمع ہوگئے ہیں۔ تلوار کا عنصر اگر آپ اپنی شخصیت سے نکال دیں تو پھر آپ بزعم خود خواہ کتنے ہی متقی اور پارسا کیوں نہ بنتے پھریں، واقعہ یہ ہے کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اتباع کا اعزاز حاصل نہیں ہوسکتا۔